فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
خاص مضمون	تبدیلی کیسے لائی جائے	قاضی حسین احمدؒ	14
نوائے شوق	مرگِ احساس	عنایت علی خان	24
	غزل	کرامت بخاری	25
حقیقت و افسانہ	بی بی سواری	حفصہ محمد افضال	26
	کاش ایسا ہو!	روبینہ اطفال	32
	جائے عبرت	توقیر عائشہ	34
	بجیا	جویریہ شریف	36
انتخاب	محافظ	شاہدہ ناز قاضی	37
سلسلہ وار کہانی	نقشِ یقین	نصرت یوسف	40
خفتگانِ خاک	آپا جان زبیدہ بلوچ کی یادیں	ڈاکٹر ثمین ذکا	44
نہاں خانۂ دل	زہے مقدر!	فرحت طاہر	50
ملاقات	مولانا مودودیؒ کی صاحبزادی سے ملاقات	آسیہ راشد	54
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	64
ذرائع ابلاغ	ہمارے ٹی وی چینلز پر کیا دکھایا جا رہا ہے؟	مسز ارشد، ذکیہ فرحت	69
بتول میگزین	مسز آفاق، زینب بتول، جویریہ شریف، فرزانہ خالد		74
محشرِ خیال	فرحت طاہر، مدیحۃ الرحمان		77
گوشۂ تسنیم	خودکار نظامِ دفاع	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	79
قولِ نبی	اہلِ جنت کون؟	عظمیٰ پروین	

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! خدا خدا کر کے موسم کے تیور بدلے، تپش کم ہوئی اور ہواؤں میں سرما کی چاپ سنائی دینے لگی۔ سال بہ سال مختصر تر ہوتا یہ موسم سرما کرۂ ارض کی ماحولیاتی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ چند روز کا ہی سہی، گرمی کی شدت سے تھکی ہاری آبادیوں کے لیے یہ ریلیف بھی خدا کی بے پایاں رحمت ہے۔ زرد پڑتے ہوئے پتے گرتے دیکھ کر۔۔۔اور گرتے پتوں کے فرش پر چلتے چلتے۔۔۔منصورہ احمد بے طرح یاد آئی!

یہ شاید پتوں کے گرنے کا موسم ہے
یہ شاید رشتوں کے مرنے کا موسم ہے
کتنے سارے پتے شاخوں سے ٹوٹے ہیں
کتنے سارے بندھن ہاتھوں سے چھوٹے ہیں
رسمی پُرسش، باسی لہجے
موسم کی تلخی کے قصے
حبس میں گھٹتی ان سانسوں سے
دردِ رفاقت کیسے بانٹیں
رشتے اور انساں مر جائیں تو بوجھل ہو جاتے ہیں!

محرم الحرام سالِ نو کا آغاز بھی ہے اور اس بھولے ہوئے سبق کا اعادہ بھی، کہ لوگوں کے معاملات کی نگرانی اہل، با اصول اور با کردار افراد کے ہاتھوں میں دینا اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ جہاں اس اصول پر زد پڑے، وہاں اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہونا اور اس راہ میں جان کی بھی پروانہ کرنا حسینیت ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر اہلِ حق کے ساتھ پیش آنے والی کربلائیں اسلام کی زندگی کا روشن استعارہ ہیں۔ آج ہم نے مصر میں یہی کربلا دوبارہ برپا ہوتے دیکھی۔ ان شاء اللہ یہ بھی جلد یا بدیر نئی صبح کا پیش خیمہ اور امت کی بیداری کا سبب بنے گی۔ مسلم دنیا کے لیے مغرب کے دہرے معیارات دنیا بھر میں اس کی اصلیت کھول رہے ہیں۔ خود مسلم دنیا کے اندر یک جہتی اور دینی حمیت کا فقدان ہے جس کا فائدہ دشمن اٹھاتے ہیں۔ ان حالات میں امام حسینؓ اور ان کے گھرانے کی سنت اس دنیا کے ہر با اصول، باضمیر شخص کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ بقول شاعر

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؓ

مہینے کا آغاز کنٹرول لائن پر بھارتی جارحیت سے ہوا۔ نریندر مودی کی حکومت آنے کے بعد سے بھارت کی جانب سے ایسے اقدامات متوقع تھے اور نواز حکومت کو یک طرفہ امن کی آشا جیسی پالیسیوں پر خبردار کیا جا رہا تھا۔ مسئلہ کشمیر تو رہا ایک طرف، ہمیں تو بلوچستان سمیت ملک کے دیگر حصوں میں بھی بھارتی ایجنسیوں کی دہشت گردی کا سامنا ہے۔ اوپر سے شدت پسند ہندو تنظیم کا برسرِ اقتدار آ جانا ہمارے ہوشیار ہو جانے کے لیے کافی ہونا چاہیئے تھا۔ ان حالات میں پاکستان کی طرف سے دوستی اور امن کی خواہش کو کمزوری سمجھا گیا۔ ان

بلا اشتعال حملوں اور معصوم شہریوں کی ہلاکت کے بعد جو کھوکھلے بیانات داغے گئے، وہ ایک جرات مند موقف اور پالیسی کے طور پر پہلے سامنے آجاتے تو اس نقصان کی پیش بندی ہو سکتی تھی۔

۱۹۷۱ میں پاکستان سے جرمِ وفا کے مرتکب پروفیسر غلام اعظم اپنے جرم کا حساب دینے رفیقِ اعلیٰ کے پاس پہنچ گئے۔ بنگلہ دیش جماعتِ اسلامی کے یہ سابق امیر حسینہ واجد کے نظامِ عدل کے ہاتھوں نوے برس کی عمر میں ننانوے برس کی سزائے قید کے مستحق ٹھہرے تھے۔ مگر ایک برس بعد ہی انہوں نے انصاف کے لیے عادلِ حقیقی سے رجوع کر لیا۔ اللہ ان کی مساعی جمیلہ قبول فرمائے اور انہیں اپنے ہاں بہترین میزبانی کا شرف بخشے آمین۔ اس شہیدِ وفا، شہیدِ پاکستان کا جنازہ بیت المکرّم ڈھاکہ میں ''سابق پاکستانیوں'' نے جس تعداد میں اکٹھے ہو کر اور جس جذبے سے پڑھا، اسے دیکھ کر اپنے ''پاکستانی'' ہونے پر شرم آتی ہے! حسینہ کے لہو کی پیاس اور بھارت کی خوشنودی کی آس اب بھی نہ بجھ سکی۔ اب اس نے پروفیسر صاحب کے انتقال کے بعد۔۔۔ شاید انتقاماً۔۔۔ جماعت اسلامی ہی کے ایک اور بزرگ رہنما مطیع الرحمان کو سزائے موت سنا دی ہے۔

قادری صاحب کا دھرنا تو اختتام پذیر ہوا، مگر تحریکِ انصاف کی ڈی چوک میں سرگرمی ابھی جاری ہے اور استعفے کا مطالبہ برقرار ہے۔ اگرچہ اب اس میں نتائج کی وہ کشش نہیں رہی جس نے ہر خاص و عام کو متوجہ کر رکھا تھا۔ اب ہر طرف ان دھرنوں کے فائدوں اور نقصانات پر بحث ہو رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں میں آگاہی بہت پیدا ہوئی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نئے پاکستان کی منزل کو اتنا قریب لا کر محض آگاہی پر اکتفا کر لینا مایوسی کا بھی باعث بنا ہے۔ دو گروہوں کی ملی بھگت سے تنگ آئے ہوئے لوگوں نے ڈی چوک سے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اس صورتحال کا بھرپور اظہار ان قوتوں، خاص طور پر تحریکِ انصاف کے ملک گیر جلسوں میں عوام کی غیر معمولی اور فقید المثال شرکت سے ہوا۔ عمران خان پر لوگوں کے اعتماد کا برقرار رہنا اب اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اس ڈھائی ماہ طویل جدوجہد سے کیا ثمرات لے کر عوام میں پلٹتے ہیں۔ ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ ان کے انتخابی امیدوار کس معیار کے لوگ ہیں۔ اگر وہ اچھے کردار کے ایماندار لوگوں کو پارلیمنٹ میں نہیں لاتے تو کوئی ٹھوس تبدیلی خیال و خواب ہی رہے گی۔ اس سلسلے میں اب تک کی صورتحال ہرگز امید افزا نہیں ہے اور ملتان کی نشست پر ان کے حمایت یافتہ امیدوار کے بارے میں بھی یہی خیال ظاہر کیا جا رہا ہے۔

پٹرول اور فرنس آئل کی قیمتیں عالمی منڈی میں کم ہونے کے باوجود ایک بار پھر بجلی کی قیمتیں بڑھا دی گئی ہیں۔ گرمی کا موسم ختم ہونے پر بھی لوڈ شیڈنگ کے اوقات میں کمی نہیں آئی۔ لاہور اور اسلام آباد میں میٹرو اور اوور ہیڈز کے منصوبے دیکھ کر کسی طرح محسوس نہیں ہوتا کہ حکومت پاور پلانٹس کی اربوں کی مقروض ہے۔ جمہوری نظام چیک اینڈ بیلنس کے ذریعے عوامی بہبود کے لیے ترجیحات کا تعین کرنے کا نام ہے۔ اختیارات کو محض سیاسی فائدوں کے لیے استعمال کرنا جمہوریت کے ساتھ مذاق کے سوا کچھ نہیں۔

حاجیوں کی وطن واپسی مکمل ہوئی۔ حج کی سعادت حاصل کرنے والوں کو دلی مبارکباد کے ساتھ اجازت کی طلب گار ہوں۔

صائمہ اسما

قاضی حسین احمد

تبدیلی کیسے لائی جائے؟

ماضی کے جھروکوں سے ایک یادگار تحریر ''جماعت اسلامی کے کام میں ثبات وتغیر کے اصول'' جو جماعت اسلامی پاکستان کے سہ روزہ اجتماع عام کی مناسبت سے شائع کی جا رہی ہے۔ آج جبکہ ہر طرف تبدیلی اور انقلاب کا شور وغوغا ہے، تئیس سال پیشتر لکھی گئی یہ تحریر آج اسلامی تحریکوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔

اگست ۱۹۹۱ میں جماعتِ اسلامی کے قیام کے پچاس سال پورے ہو گئے ہیں، اگرچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس سے بھی تقریباً ۱۵ سال قبل جماعتِ اسلامی کے نصب العین اور قیام کی دعوت کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ مرکزی مجلسِ شوریٰ نے یہ طے کیا ہے کہ پچاسویں سال کے موقع کی مناسبت سے جماعتِ اسلامی کی دعوت زیادہ زور شور سے پیش کرنے، عوام میں اسے وسیع پیمانے پر روشناس کرانے' اور خود جماعت میں نئے ولولہ اور یکسوئی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھنے کا عزم بیدار کرنے کے لیے خصوصی تقریبات کا اہتمام کیا جائے۔

ہم گزشتہ پچاس سالوں میں کن کن مراحل سے گزرے، کیا کیا رکاوٹیں راستے میں پیش آئیں، ہم نے کیا کیا پیش قدمیاں کیں، یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس داستان کی تاریخ بعض احباب نے لکھی ہے' اور کچھ لکھی جا رہی ہے۔ میں اس وقت مجلسِ شوریٰ کے فیصلہ کے تحت منعقد کی جانے والی پچاس سالہ تقریبات کے موقع کی مناسبت سے، ماضی و حال کی روشنی میں، یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم آج کس مرحلہ میں ہیں، ہمیں کیا چیلنج درپیش ہیں، ہم ان کا مقابلہ کس طرح کر رہے ہیں' اور آئندہ ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تقریباً سارا عالمِ اسلام مغربی تہذیب اور مغربی سامراج کے تسلط میں تھا۔ اس کا اکثر حصہ' برصغیر' براہِ راست برطانیہ کی مضبوط گرفت میں تھا۔ اسلام کا نام بھی تھا، مذہبی مراسم بھی ادا کیے جاتے تھے، دینی دعوت وتعلیم بھی جاری تھی، لیکن دین کے اس تصور کا شعور خال خال لوگوں میں پایا جاتا تھا کہ اس کا قیام ہی ہر مسلمان کا انفرادی طور پر' اور امتِ مسلمہ کا بحیثیت مجموعی، مقصدِ حیات ہے۔ بحیثیت ایک جامع نظامِ زندگی کے بھی دین کا تصور اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دین کے قیام کے لیے جدوجہد میں زندگی کے آثار بھی مفقود تھے۔ ان حالات میں پورا عالمِ اسلام مایوسی اور افسردگی کا شکار تھا۔

برصغیر کے مسلمان، آٹھ سو سال حکومت کر کے، انگریز کی غلامی میں جا چکے تھے۔ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ' خلافت تحریک کی ناکامی، ہندو سامراج کی ریشہ دوانیاں، پہلے انتخابات کے نتیجہ میں قائم ہونے والی اکثریتی ہندو حکومتوں کے مظالم...... ان سب عوامل کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلمانوں پر مایوسی اور افسردگی کے زیادہ ہی گہرے سائے چھائے ہوئے تھے۔

مایوسی کے اس عالَم میں کچھ علماء ضرور مسلمانوں کو دین کی طرف دعوت دے رہے تھے، علامہ اقبالؒ نے بھی امید کی ایک شمع روشن کر رکھی تھی' لیکن ان سب کا کام زیادہ تر صرف پیغام تک محدود تھا۔ ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر، اقامتِ دین کا جھنڈا اُٹھا کر، منظّم جدوجہد کی راہ پر قدم اُٹھانے کے لیے حوصلہ' ہمت اور آمادگی اپنے اندر نہ پاتا تھا۔

ان حالات میں' خالص دین کی بنیاد پر مسلمانوں کی صف بندی کرنے کیلئے عملی تحریک برپا کرنے کی سعادت مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں آئی۔ انہوں نے نہ صرف مغربی تہذیب کا طلسم توڑا، اسلام کا تصور بحیثیت ایک جامع نظامِ زندگی کے اجاگر کیا، بلکہ اسلام میں جہاد کا مقام اور اس کی اہمیت کا احیاء کیا۔ مولانا مودودی نے مسلمانوں کو پکارا کہ جن حالات سے ان کو سابقہ درپیش ہے، ان حالات میں اقامتِ دین ''فرض کفایہ نہیں بلکہ فرضِ عین ہوتا ہے' اور ہر وہ شخص قابلِ مواخذہ ہو گا جو قدرت واستطاعت کے باوجود اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کے لئے جان لڑانے سے گریز کرے گا۔'' ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ ''احکامِ کفر کے مقابلہ میں احکامِ الٰہی کے اجرا کی کوشش بہر حال اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس کے لیے

ہر وہ شخص قابلِ مواخذہ ہوگا جو قدرت و استطاعت کے باوجود اقامتِ دین اور حفاظت دین کے لئے جان لڑانے سے گریز کرے گا۔''

جماعت کا وجود، اور جو جماعت موجود ہو اس کا التزام ضروری ہے۔''
(رسائل ومسائل، چہارم)

اُنہوں نے کھول کھول کر یہ بات سمجھائی کہ اقامتِ دین کا مقصد ہی وہ اصل مقصد ہے جس کی خاطر انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے۔ یہی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد تھا۔ (الفتح: ۲۸)

اور یہی امتِ مسلمہ کا اصل مقصد اور فریضہ ہے۔ امّت کے ہر فرد پر فرض ہے کہ وہ فریضہ اقامتِ دین کی اس منظّم جدوجہد میں اپنا حصہ ادا کرے، (آل عمران: ۱۱۰) (البقرۃ: ۱۴۳)

اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچنے کے لیۓ اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ بھی یہی ہے کہ ایک مومن اپنی پوری زندگی اور وسائل اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے جہاد میں لگا دے۔

یہی وہ باتیں تھیں جنہوں نے بے شمار سعید رُوحوں کو مضطرب کر دیا، انہوں نے مولانا مودودیؒ کی پکار پر لبیک کہا، اور ۲۶ اگست ۱۹۴۱ کو لاہور میں جماعت اسلامی قائم ہوگئی۔

پچاس سال پہلے اگرچہ چند ہی رفقاء سفر اکٹھے ہوئے، وہ بھی اکثر متوسط درجہ کے بے وسائل نوجوان، لیکن مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ سفر اس یقین کے ساتھ شروع کیا کہ ایک وقت آئے گا کہ سرمایہ داری نظام کو واشنگٹن اور لندن میں اور اشتراکیت کو ماسکو میں پناہ نہیں ملے گی۔ اسلام کو نظام غالب بنانے کی یہ تحریک بظاہر بے سروسامانی کی حالت میں شروع کی گئی۔ لیکن اس کا اصل سرمایہ چند مومن افراد کا اخلاص تھا اور یہ ایمان تھا کہ حق بذاتِ خود ایک قوت ہے۔ ان کو یقین تھا کہ جب اہل حق اخلاص کے ساتھ راہ حق میں نکلتے ہیں تو اللہ کی نصرت آتی ہے اور فیصلہ کرنے والی ذات خود اللہ رب العالمین ہے۔ اگر صالحین کا ایک ایسا گروہ وجود میں آجائے جو اس کے راستے میں مخلصانہ جدوجہد کر کے ثابت کر دے کہ وہ زمین کی وراثت کی صلاحیت رکھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ دنیا کی زمامِ کار مفسدین سے اس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

ہم سب سے پہلے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ پچاس سالوں میں مولانا مودودیؒ کا قائم کردہ قافلہ حق کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ ۱۹۴۱ کے اجتماع میں اگر ۷۵ افراد تھے، اور ۱۹۶۳ میں تقریباً سات ہزار، تو ۱۹۸۹ میں تقریباً ۷۰ ہزار افراد جماعتِ اسلامی کے کل پاکستان اجتماع کے لیے جمع ہوئے۔ انتخابات کا طریقہ ہی، ارکان کے اجتماعِ عام کے فیصلے کے مطابق، وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اپنا اصل مقصد...... زمام کار کی تبدیلی یا انقلاب امامت...... حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان انتخابات کے نتیجہ میں اگر ایک وقت ہماری قوت صفر تھی، تو آج ہم پارلیمانی زندگی میں ایک مضبوط قوت کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ ایک لادین اور سوشلسٹ قیادت کو ہم نے انتخاب ہی کے ذریعہ سے اقتدار سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ۱۹۴۹ کی قرار دادِ مقاصد، ۱۹۵۶ اور ۱۹۷۳ کے اسلامی دستور، اور ۱۹۹۱ کے شریعت بل بلاشبہ ایسے اقدامات ہیں جن کے نتیجہ میں مطلوبہ روئیدگی نمودار نہیں ہوئی، اور اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آیا، لیکن ان اقدامات نے، جمہوری ذرائع سے اور کشت وخون کے بغیر، پاکستان کو کس طرح اسلامی ریاست کے راستہ سے باندھ دیا، اور اس راستہ پر کتنا آگے بڑھا دیا، اس کا اندازہ ترکی، مصر، شام وعراق اور انڈونیشیا جیسے ممالک کو دیکھ کر آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

معاشرہ میں بگاڑ بڑھا ہے، لیکن ہماری اصلاح وتعمیر اور دعوت کی سرگرمیوں کے بغیر یہ معاشرہ کہاں پہنچ چکا ہوتا، اس کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ہماری دعوت کے نتیجہ میں لاکھوں افراد نہ صرف اپنی زندگیاں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے مطابق گزارنے میں لگے ہوئے ہیں، بلکہ عملاً معاشرے کو، دعوت کے صبر آزما کام کے ذریعہ، اسلامی بنانے کے لیے اپنا جان و مال لگا رہے ہیں۔ آج آپ کسی شعبہ زندگی میں چلے جائیں، آپ کو جماعتِ اسلامی کی دعوت کے اثرات نظر آجائیں گے۔ ملک ہی نہیں، آپ دنیا کے کسی حصہ میں جائیں، وہاں اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والوں میں اقامتِ دین اور تحریکِ اسلامی کے حوالے سے جماعت اسلامی اور مولانا مودودیؒ کو معروف اور محترم ومکرم پائیں گے۔ ہر جگہ براہِ راست جماعتِ اسلامی کے وابستگان کو متحرک پائیں گے۔ بنگلہ دیش میں

پارلیمنٹ میں توازنِ قوت جماعت اسلامی کے ہاتھ میں ہے۔ کشمیر میں ہندوستان کی غلامی سے آزادی کی جدوجہد میں جماعتِ اسلامی پیش پیش ہے۔ برطانیہ، یورپ اور امریکہ میں جماعت سے وابستگان کی منظّم جماعتیں کام کررہی ہیں۔

انفرادی لغزشوں اور غلط فیصلوں سے انسانوں کی کسی جماعت میں مفر نہیں۔ حالات میں تغیرات کے مطابق پالیسی، نظام، تدابیر، وسائل اور تکنیک میں تبدیلیاں بھی کی جاتی رہی ہیں، اور ۱۹۴۷ ہی سے کی جاتی رہی ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں انہی اصولوں کی روشنی میں کی جاتی رہی ہیں جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں، جن کی توضیح خود بانی جماعت نے فروری ۱۹۵۷ میں ماچھی گوٹھ میں ارکان کے اجتماعِ عام میں کی تھی، اور جن کی تصویب ارکان جماعت نے کردی تھی۔ قرآن وسنت کے منصوص احکام کو تبدیل کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں اور جو جماعت اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اُٹھے اس کے لیے تو یہ لازم ہے کہ وہ اسی طریق کار سے اپنی منزل کی طرف بڑھے جو طریقِ کار رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ آپ ﷺ کی طے کردہ حدود کے اندر رہے، جن چیزوں سے آپ ﷺ نے روکا اُن سے رکی رہے، اور جن وسعتوں اور جس تنوع کو آپ ﷺ نے اختیار کیا یا اجازت دی، ان میں اجتناب اور تنگی اختیار کرنے سے احتراز کرے۔

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں اور یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے، کہ ہم آج ۱۹۹۱ میں وہی الفاظ بلاتامل دہرا سکتے ہیں جو الفاظ بانی جماعت نے ۱۹۵۷ میں ارشاد فرمائے تھے۔ یہ الفاظ جماعت کے ان چند لوگوں کو مخاطب کرکے کہے گئے تھے جو خود مولاناؒ کی تحریروں سے مولاناؒ کے خلاف یہ مقدمہ قائم کررہے تھے کہ ۱۹۴۷ کے بعد جماعت نے اُن کی قیادت میں پالیسی اور تدابیر میں جو تبدیلیاں کی ہیں، اور جو تیز تر عوامی اور سیاسی جدوجہد شروع کردی ہے، اس کی وجہ سے وہ اپنے اس اصل طریقِ کار سے ہٹ گئی ہے جس کی خود انہوں نے تعلیم دی تھی۔ دینی احکام میں حکمتِ عملی کے نام پر تبدیلی کردی گئی ہے، ترمیم وتحریف کا اختیار حاصل کرلیا گیا ہے، جماعت کا اخلاقی و دینی معیار گر گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

انفرادی لغزشوں اور کوتاہیوں سے تو بہر حال کوئی جماعت خالی نہیں ہوسکتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اجتماعی حیثیت سے جماعتِ اسلامی ان اصولوں کی پوری پابندی کرتی رہی ہے (جو عقیدہ، نصب العین، شرائط رکنیت اور مستقل طریقِ کار کے تحت دستور میں درج کیے گئے ہیں)......

جماعتِ اسلامی ابتدا سے ایک سوچے سمجھے نقشے پر کام کررہی ہے۔ اس نقشے کی تفصیلات تو ہمارے ذرائع وسائل کی ترقی کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی رہی ہیں، لیکن اس کے بنیادی خطوط وہی رہے ہیں جو اول روز سے اس کام میں ہمارے پیش نظر تھے (تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، ص ۵۹-۷۳)

جماعتِ اسلامی اگر اپنے نصب العین اور بنیادی اصولوں پر قائم رہی ہے تو یہ سراسر اللہ تعالیٰ کے فضل، قرآن وسنت کی طرف رجوع اور اُن کے التزام کی سعی، اور مولانا مودودیؒ کی بصیرت سے بھرپور رہنمائی ہی کا نتیجہ ہے۔

جماعتِ اسلامی نے اپنے لیے جو طریقِ کار کتاب اللہ اور سنتِ نبوی ﷺ سے اخذ کیا وہ چار بنیادی اصولوں یا معالم وحدود پر مبنی تھا۔

۱۔ خدا اور رسول ﷺ کی ہدایت کا پابند رہنا۔

۲۔ لوگوں کو، انفرادی اور اجتماعی طور پر، وسیع سے وسیع پیمانہ پر، اللہ کی طرف بلانا، یعنی دعوت الی اللہ۔

۳۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں، اُن کا تزکیہ وتربیت کرنا اور اُنہیں منظّم کرنا، یعنی تربیت وتنظیم۔

۴۔ اس منظّم گروہ کو اصلاح معاشرہ اور انقلابِ امامت کے لیے جدوجہد کے کام میں مصروف عمل کرنا، تاکہ ہر شعبہ زندگی میں اللہ کا دین غالب ہو، یعنی جہادِ فی سبیل اللہ۔

خلافِ صداقت و دیانت ذرائع کے استعمال سے اجتناب، اصلاح وانقلاب کے لیے جمہوری وآئینی طریقوں سے کام کرنا، رائے عامہ کے ذریعے مطلوبہ تغیرات بروئے کار لانا، کھلم کھلا اور اعلانیہ کام کرنا......غور کیا جائے تو یہ سب اصول درج بالا چار اصولوں ہی کا منطقی نتیجہ ہیں، انہیں سے مستنبط ہیں۔

نظمِ جماعت کے لیے، ابتدا سے قرآن وسنت کی روشنی میں جو اصول وضع کیے گئے ان میں سمع وطاعت فی المعروف، مشاورت، باہمی

ہماری تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ معاشرے کا بگاڑ بھی بڑھ گیا ہے۔ دنیا ایک آنگن بن گئی ہے، اور تحریکِ اسلامی ایک عالمگیر حقیقت

الفت ومحبت اور احتساب اہم ترین اصولوں کے طور پر شامل تھے۔

ان اصولوں اور اس نقشہ کار کی پابندی جس طرح روزِ اول سے کی جارہی ہے آج بھی کرنا ضروری ہے۔ بلکہ آج زیادہ ہی ضروری ہے۔ آج ہمیں سنگین تر چیلنجوں سے سابقہ درپیش ہے۔ ہماری تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ معاشرے کا بگاڑ بھی بڑھ گیا ہے۔ دنیا ایک آنگن بن گئی ہے، اور تحریکِ اسلامی ایک عالمگیر حقیقت۔ اب اس کے دشمن اپنے ملک ہی میں نہیں ہے، بلکہ غالب سامراجی قوتیں بھی اس کے درپے ہیں۔ جدید وسائل حمل ونقل اور ذرائع ابلاغ نے غالب لادینی تہذیب کو ایک ایک گھر میں گھسنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ان حالات میں جماعت کا کوئی ادنیٰ کارکن بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ تحریک اپنے بنیادی اصولوں اور نقشہ کار میں کچھ ترک کر کے یا کچھ لچک پیدا کر کے اپنے نصب العین کی طرف پیش قدمی کر سکتی ہے۔

جماعت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے انہی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے آج کے مرحلہ میں دعوت کے کام کو اپنے منصوبوں میں اولین ترجیح دی ہے۔

عوام میں اثر ونفوذ کی تیز تر مساعی کے باوجود، تربیت کے ضمن میں معمول کے سارے پروگرام اسی طرح جاری ہیں جس طرح وقتاً فوقتاً وضع کیے جاتے رہے ہیں۔ مرکزی تربیت گاہ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ دائرۂ تعلیم وتربیت کا آغاز کر کے ایک ایسی تربیت گاہ کے اس خواب کو بھی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جارہی ہے جو دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے بہترین کارکن تیار کرے۔ (روداد اول، ص ۳۶) لیکن تربیت کی یہ ساری کوششیں کافی نہیں ہیں۔ ان کو تیز تر اور وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ پانچ سالہ منصوبہ میں جو بنیادی رہنما اصول طے کیے گئے ہیں اور جو طریقے تجویز کیے گئے ہیں، کارکنوں اور جماعتوں کو پورے اہتمام سے ان کا التزام کرنا چاہیے۔ خصوصاً ہر کارکن کو اپنی تربیت آپ کے اصول پر، سب سے بڑھ کر اپنی سیرت وکردار کی تعمیر کی کوشش میں لگا رہنا چاہیے۔ تربیت یافتہ کارکن ہماری تحریک میں مرکز ومحور اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تحریک کے لیے موجودہ مرحلے میں عوام کو سنبھالنے کے لیے باصلاحیت، تربیت یافتہ کارکنوں کی شدید ضرورت ہے۔

یہاں دعوت وتربیت کے ضمن میں یہ اعتراف ضروری ہے کہ ہدایات اور منصوبوں کے باوجود عملی کارکردگی میں بہت کوتاہیاں ہیں۔ مگر انسانوں میں عزائم، منصوبوں اور ہدایات اور ان پر عمل اور نتائج کے درمیان ہمیشہ تفاوت ہوا کرتا ہے۔ انسان عزم کا کچا ہے۔ یہ بات خامیوں، کوتاہیوں اور سہل انگاریوں کے لیے وجہ جواز ہرگز نہیں بنائی جا سکتی۔ لیکن اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ تفاوت ہمیشہ رہا ہے۔

جماعت میں ارکان ووابستگان کے اخلاقی ودینی معیار کے گرنے کا مسئلہ بھی بار بار ذہنوں میں اُٹھتا ہے اور اٹھایا بھی جاتا ہے یہ بحث بھی روزِ اول سے چلی آرہی ہے۔ رودادیں ارکانِ جماعت کی حالت پر شکایات سے بھری ہوئی ہیں۔ جائزہ کمیٹی نے تو ایسی تصویر کھینچی تھی...... آج سے ۳۵ سال قبل...... کہ مولانا مودودیؒ کو یہ کہنا پڑا تھا کہ ''اگر ساری جماعت بحیثیت مجموعی بگڑ گئی ہے تو اسے توڑ دیجئے۔'' پھر یہ بھی کہ ''پوری جماعت کے متعلق ...... ہر پہلو سے کامل اطمینان کی رپورٹ شاید آپ کبھی نہ پائیں گے۔'' آخری بات اُن کی اس ضمن میں یہ بھی اہم ہے کہ ''میرے علم میں ایسا کوئی طریقِ تربیت اب تک نہیں آیا ہے جو معیارِ مطلوب کے آدمی تیار کرنے کی سو فیصد ضمانت دیتا ہو'' (آئندہ لائحہ عمل)......

لیکن میں پھر یہ کہوں گا کہ یہ باتیں جواز، تاویل اور غفلت کی بنیاد نہ بننا چاہئیں ہاں، مایوسی سے بچنے اور رومانوی دنیا سے نکل کر حقیقت پسند بننے کے لیے ان کا ادراک ناگزیر ہے۔

جماعت کی پچاس سالہ ترقی کا راز جہاں اپنے نصب العین، بنیادی اصولوں اور نقشہ کار کی پابندی میں مضمر ہے، وہاں یہ بات ثبات وتغیر کے ان حکیمانہ اصولوں پر کاربند رہنے کا نتیجہ بھی ہے جن کی تعلیم قرآن وسنت میں دی گئی ہے اور جن کی توضیح مولانا مودودیؒ نے ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں بڑی تفصیل سے فرمائی۔ آج کے مرحلہ میں بھی جماعت اگر پیش قدمی کر سکتی ہے تو اسی بصیرت، اور ثبات وتغیر کی اسی

جماعت کی پچاس سالہ ترقی کا راز جہاں اپنے بنیادی اصولوں کی پابندی میں مضمر ہے، وہاں یہ بات ثبات وتغیر کے ان حکیمانہ اصولوں پر کار بند رہنے کا نتیجہ بھی ہے جن کی تعلیم قرآن وسنت میں دی گئی ہے۔

حکمتِ عملی کو اختیار کر کے کر سکتی ہے جو مولانا مودودیؒ نے اختیار کی۔ جو جماعتیں یہ نہ سمجھ سکیں کہ کیا نہیں بدل سکتا، جو ہر چیز بدلنے کو تیار ہوں یا ہر تبدیلی سے بدکتی ہوں، وہ اپنے مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہیں، اور اُن کو زمانہ ایک داستانِ پارینہ بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔

پہلا اصول یہ واضح کیا گیا کہ ''تدابیر کا ردّ و بدل ایک دوسری چیز ہے، جسے بعض لوگ غلطی سے اصول کا ردّ و بدل قرار دے بیٹھے ہیں۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۵۹)

دوسرا اصول یہ واضح کیا گیا کہ ''فطری طریقِ انقلاب کا یہ تصور کہ وہ کوئی لگا بندھا طریقہ ہے جو ہر جگہ ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ڈھنگ پر چلنا چاہیے، سراسر ایک غیر معقول تصور ہے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۵۸)

تیسرا اصول یہ واضح کیا گیا کہ ''ایک طریق کار کے بنیادی اصولوں اور حالات پر ان کے عملی انطباق کی مختلف اشکال کے درمیان فرق کرنا عقل مندی کا تقاضا ہے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۱۷)

چوتھا اصول یہ واضح کیا گیا کہ ''دنیا میں کوئی جماعت بھی ایک تدبیر کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتی۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۵۹)

پانچواں اصول یہ واضح کیا گیا کہ ''خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں کو سخت مخالف و مزاحم ماحول میں سے اپنا راستہ نکالنا ہو، اُن کے لیے تو یہ ناگزیر ہے اور دانائی کا تقاضا بھی کہ اگر ایک وقت اُنہوں نے ایک تدبیر کو صحیح اور مناسب پا کر اختیار کیا ہو اور دوسرے وقت وہ تدبیر موزوں اور کارگر نہ رہے، تو وہ بلا تامل اس کو کسی بہتر اور حالات کے لحاظ سے مناسب تر تدبیر سے بدل لیں۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۵۹-۶۰)

چھٹا اصول یہ واضح کیا گیا کہ ''دانائی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ حالات میں واقع ہونے والے اہم تغیرات کا نوٹس لیا جائے اور بدلے ہوئے حالات کے لحاظ سے طریقِ کار میں ضروری ردّ و بدل سے گریز نہ کیا جائے۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۱۷)

ثبات وتغیر کے ان اصولوں کا اطلاق ہم گزشتہ پچاس سال میں جس طرح کرتے رہے ہیں اس کا ایک مختصر جائزہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ہم طریقِ کار میں قرآن وسنت کی ہدایات کے پابند ہیں۔ لیکن ہر صاحبِ علم آدمی یہ جانتا ہے کہ قرآن وسنت کے احکام کی فہم وتعبیر میں بھی انسانوں کے درمیان اور مختلف زمانوں میں اختلاف وتبدیلی کا عمل جاری رہا ہے۔ یہی معاملہ ہمارے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ مثلاً تاسیسِ جماعت کے وقت ہم نے یہ تعبیر اختیار کی کہ ''علمِ کتاب وسنت اور حکمت عملی دونوں کا اقتضا یہی ہے کہ...... امیر کا انتخاب کسی مدت کے ساتھ مقید نہ ہو۔'' (روداد اول، ص ۳۰) بعد میں ہم نے اپنے دستور میں امیر کے انتخاب کو پانچ سال کی مدت کے ساتھ مقید کیا۔

جب محترمہ فاطمہ جناح کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو، عورت کی سربراہی کو ناجائز سمجھنے کے باوجود، مرکزی مجلسِ شوریٰ نے طے کیا کہ ''شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت میں تبدیل نہیں ہو سکتی، اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر، ضرورت کی حد تک، جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے'' چنانچہ آمریت سے نجات پانے کی ضرورت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا گیا، مگر یہ واضح کر دیا گیا کہ نہ یہ فیصلہ آئندہ کے لیے نظیر ہوگا، نہ اس سے حکم کی شرعی نوعیت بدل سکتی ہے۔

ایک وقت یہ سوال بھی اُٹھایا گیا کہ اگر انتخابات صرف ایک لادینی دستور کے تحت ہی ممکن ہوں یا انتخابات کا دروازہ مسدود ہو، تو کیا ایسے انتخابات میں حصہ لیا جا سکتا ہے (جو ہمارے عقیدہ کے خلاف ہے)، یا مسلح انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ''موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظامِ حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آ جانا ممکن ہو تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریقے سے''۔ اور اگر پُرامن ذرائع سے ممکن نہ ہو تو ''ہم دعوت عام

جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۰۵۔۱۰۶)

۱۹۴۷ میں قیامِ پاکستان کے بعد حالات میں جو عظیم تغیر رُونما ہو گیا، مولانا مودودیؒ کی قیادت میں جماعت نے اس کا بروقت نوٹس لیا اور بدلے ہوئے حالات میں اپنے ابتدائی طریقِ کار میں ردّ و بدل کیا۔ مولانا مودودیؒ نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ کو لاء کالج لاہور میں تقریر کرتے ہوئے ۴ نکاتی مطالبہ نظامِ اسلامی پیش کیا، اور اسی طرح اگست ۱۹۵۲ میں مطالبہ دستور اسلامی پیش کیا۔ ان مطالبات کو منوانے کے لیے جماعت نے رائے عامہ کو ہموار کرنے کیلئے عوام سے جذباتی اپیل بھی کی اور عوامی جدوجہد بھی شروع کر دی۔ ''یوں ہماری تحریک نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۴۰) بعد میں مرکزی مجلسِ شوریٰ نے، اور آٹھ سال بعد ارکان کے اجتماعِ عام نے اس دُوررس تبدیلی کی توثیق کر دی۔

مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں ''ہم سخت نادان ہوتے اگر اس موقع کو ہاتھ سے کھو دیتے اور اپنے آپ کو قبلِ تقسیم ہی کی پوزیشن میں سمجھے بیٹھے رہتے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۴۸) اور اگر ''ہم ان حالات میں قبلِ تقسیم کے طریق پر ہی کام کرتے رہتے تو اپنے مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۲۰)

ہم نے اپنے اپیل کے طریقے میں تبدیلی کی۔ ہم نے اپنے کام کے ڈھنگ میں تبدیلی کی۔ پہلے ہم دعوت کا کام چند متعین طریقوں سے بہت محدود پیمانے پر کر رہے تھے۔ اب ہم نے مطالبہ نظامِ اسلامی کے وسیلے سے لاکھوں آدمیوں تک دعوت پہنچانے، اور ہزاروں کو اپنی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ مستحکم توسیع تو ''دھیمی رفتار سے محدود پیمانے پر ہی ہو سکتی ہے۔'' اور اس وقت تک کام اسی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس مستحکم مگر سست رفتار توسیع سے نئے حالات کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہ ہوتی کہ ''بڑے پیمانے پر توسیع کے جو مواقع ہمیں حاصل تھے ان کو ہم چھوڑ دیتے' اور بجائے خود اس توسیع کے جو فوائد ہیں ان کو نظر انداز کر دیتے۔'' اس طرح ہم نے اپنی پیش قدمی کی رفتار بھی تبدیل کی۔ کشمکش کی راہ پر تدریجی ارتقاء کے ساتھ بڑھتے بڑھتے ہم نے ''دفعۃً جدوجہد کے مرحلے میں قدم رکھ دیا۔'' اور سب سے بڑھ کر یہ دستوُرِ اسلامی کے مطالبہ پر کشمکش کا آغاز کر دیا۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۴۳۔۱۴۶)

عوامی جدوجہد کے میدان میں آئے تو ریزولیشن بھی پاس ہوئے، جلوس بھی نکلے، زندہ باد اور سیدی سیدی، مُرشدی مُرشدی کے نعرے بھی لگے، جھنڈے بھی بنے، ہار بھی پہنائے گئے، استقبالیے بھی دیئے گئے، تھیلیاں بھی پیش کی گئیں، غلافِ کعبہ کا گشت بھی ہوا۔ اور بالآخر یوم شوکتِ اسلام بھی منایا گیا۔ اور یہ سب کچھ مولانا مودودیؒ کی زیرِ قیادت ہوا، حالانکہ خود اُن کی یہ تحریر موجود تھی کہ ریزولیشن، جلوس، نعرے وغیرہ اس تحریک کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ فقیہ تھے، لکیر کے فقیر نہ تھے۔

ان میں سے کوئی تبدیلی بھی نہ اصول کی تبدیلی تھی، نہ بنیادی تبدیلی۔ لیکن بعض لوگ عمل درآمد کی ہر نئی شکل کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اصول بدل گئے اور جماعت اپنی راہ سے ہٹ گئی۔ ان کو بتایا گیا کہ ''جو شخص حالات اور مواقع اور ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ ان اصولوں پر عملدرآمد کی شکلیں نہ بدل سکے اس کی مثال میرے نزدیک اسی عطائی طبیب کی سی ہے جو کسی حکیم کی بیاض کا ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے تمام مریضوں پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔''

اس طرح جب مولانا مودودیؒ نے یہ سمجھا کہ جماعت کا نظام بوجوہ آنے والے دور کی ساری ضروریات کو اپنے اندر نہیں سمیٹ سکے گا، تو نہ صرف جماعت میں متفق کا درجہ بنایا گیا، بلکہ متبادل انتظامات بھی کیے گئے۔ طلبہ کے لیے علیحدہ تنظیم قائم ہوئی، جو نہ ہر سطح کے جماعتی نظم کے تحت تھی اور نہ قانوناً مرکز کے تحت۔ اس کے بعد، مزدوروں کے لیے، کسانوں کے لیے، اساتذہ کے لیے، اور کئی دیگر ضروریات کے لیے مختلف نظم قائم ہوتے چلے گئے۔ کسی کے بارہ میں یہ نہ سمجھا گیا کہ کوئی

''ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہوتی رہیں گی اگر ان کے ساتھ ساتھ ان کی پُشت پر ایک مضبوط رائے عامہ بھی تیار نہ ہوتی جائے۔ جس طرح تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رُونما نہیں ہوسکتا،

جماعت کے نظم کے متوازی نظم قائم کیا جا رہا ہے۔ جب یہ سمجھا گیا کہ برائی بیباک اور جری ہوگئی ہے اور نیکی اور شرافت پست ہمتی، بزدلی اور کمزوری کے ہم معنی ہوکر رہ گئی ہے، تو نہ صرف جماعت کے نظم کو اس صورتِ حال کے مداوا کے لیے تیار کیا گیا بلکہ ڈیموکریٹک یوتھ فورس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسی ضمن میں غنڈہ گردی اور فواحش کے انسداد کے سلسلہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ''ہم صرف اخلاقی تلقین پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے، بلکہ معاشرہ کے شریف عناصر کو ان برائیوں کے مقابلے میں منظّم کرکے ان کے خلاف عملی جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۸۱) اس کے بھی یہ معنی نہ تھے کہ ہم آئینی و جمہوری ذرائع ترک کر کے تشدد کی راہ پر گامزن ہو رہے تھے۔

کیونکہ ہمارا طریقِ کار ہمیں جمہوری و آئینی ذرائع کا پابند کرتا ہے اور ہم نے انتخابات ہی کو تبدیلی قیادت کے ذریعہ کے طور پر اختیار کیا ہے، اس لیے جمہوریت کے دفاع میں ہم ہمیشہ پیش پیش رہے، اور ہم نے ہمیشہ مارشل لاء کی مخالفت کی۔ مارشل لاء نے خواہ اسلام کے خلاف پوزیشن لی ہو یا اس کے حق میں، ہم نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ آمریت سے نجات پانے کے لیے ہم نے سہروردی، بھاشانی، مجیب الرحمٰن، ولی خان، جیسے لوگوں تک سے تعاون کرنے سے دریغ نہ کیا۔ یہ آمریت خواہ فوجی لبادے میں ہو، خواہ شہری لباس میں۔ جب مارشل لاء نے اسلام کے نفاذ کا نعرہ بلند کیا تو اس وقت بھی مجلسِ شوریٰ کی قرار دادیں گواہ ہیں، ہم اس کے فریب میں نہ آئے، اور مسلسل بحالی آئین و جمہوریت اور انعقادِ انتخابات کا موقف اختیار کیے رہے۔

آج بھی کاروانِ دعوت و محبت، پبلک ریلیاں، بڑے بڑے جلوس، اسلامی جمہوری اتحاد، پاسبان، وغیرہ وغیرہ...... یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ یہ تاریخ کا تسلسل ہے جو جاری ہے، اور جاری رہے گا۔ ۱۹۴۷ کے بعد بھی تبدیلیاں، نئی تدابیر، اور ایک ہی اصول کے عمل کی بدلتی ہوئی شکلیں دیکھ کر کچھ لوگ مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔ آج بھی ایسا ہوتا ہے۔ ان کو نہ صرف ثبات

وتغیر کے درج بالا وہ چھ اصول سامنے رکھنا چاہئیں جن کو مولانا مودودیؒ نے بیان فرمایا، بلکہ اُن کے یہ الفاظ بھی یاد رکھنا چاہئیں کہ ''تبدیلی کے معنی یہ نہیں کہ پہلے طریقے کو ہم نے بالکل ترک کر کے صرف اس دوسرے طریقے پر اعتماد کر لیا۔ اس توسیعی کوشش کے ساتھ ہم اپنے سابقہ طریقے کے مطابق استحکام کی سعی بھی کرتے رہے ہیں اور اس کی اہمیت و ضرورت ہماری نگاہوں میں علیٰ حالہٖ قائم ہے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۴۴)

آج کے مرحلہ میں ہماری تحریک کو جو بڑے بڑے چیلنج درپیش ہیں، جن بدلتے ہوئے حالات کا سامنا ہے، وہ ہماری بنیادی فکر کا منطقی نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ہم آئینی و جمہوری طریقوں، رائے عامہ کے تغیر اور انتخابات کے ذریعہ مطلوبہ انقلاب لانے کی پابند ہیں، اس لیے عامتہ المسلمین کو اپنے نصب العین کی حمایت میں کھڑا کر دینا ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ کیونکہ دنیا میں اور خود ہمارے ملک میں، اصل غلبہ مغرب کی لادینی تہذیب اور استعماری قوتوں کو حاصل ہے، اس لیے ہمیں اسلامی تحریکات کے خلاف عالمی طاقتوں کے منصوبوں سے عہدہ برآء ہونے کے لیے منصوبہ بندی کرنی ہے۔ یہ ہمارے لیے دوسرا بڑا چیلنج ہے۔ ان دونوں باتوں کو مولانا مودودیؒ نے تحریک کے آغاز ہی میں بڑے خوبصورت انداز میں یوں واضح کر دیا تھا۔

''ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہوتی رہیں گی اگر ان کے ساتھ ساتھ ان کی پُشت پر ایک مضبوط رائے عامہ بھی تیار نہ ہوتی جائے۔ جس طرح تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رُونما نہیں ہوسکتا، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ عامتہ الناس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہو سکے۔ ہمیں نہ صرف ہندوستان، بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی آواز پہنچانا ہوگی۔ کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہوسکتا جب تک وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عامہ اس کی تائید میں تیار نہ کر لی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے، کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس

الاستاذ المودودیؒ اور امام حسن البناؒ اس دور کی اسلامی تحریکوں کے دو مسلم رہنما ہیں۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں کی جدید پڑھی لکھی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا

حدتک متاثر ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اُٹھ رہے ہیں، لاکھوں انسانوں کو ہماری پُشت پر اخلاقی وعملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونا چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصدِ عظیم کے لیے کوئی خطرہ، کوئی نقصان، کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ (روداد اول، ص ۶۶۔۶۷)

کیونکہ صرف کسی ایک ملک میں، عالمی دعوت کے بغیر، انقلاب برپا نہیں ہوسکتا، خصوصاً آج کے جیٹ اور سیٹلائٹ کے دور میں اور کیونکہ عالمی طاقتیں اسلامی تحریکات کو ناکام بنانے کے لیے عرصہ سے منصوبہ بندی کررہی ہیں، اس لیے اس مرحلہ میں رفقائے جماعت کو بین الاقوامی صورتحال کا بھی پورا ادراک ہونا چاہیے۔

جن دنوں برصغیر ہندو پاک میں جماعتِ اسلامی کی تحریک برپا ہو رہی تھی، اُنہی دنوں میں مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک حسن البنا شہیدؒ کی رہنمائی میں مصروف عمل تھی۔ اس کے مقاصد وہی تھے جو جماعتِ اسلامی کے مقاصد تھے۔ طریقِ کار میں جزوی فرق موجود تھا، لیکن طریقِ کار کے اصول چونکہ قرآن وسنت کی راہنمائی میں طے کیے گئے تھے اس لیے یہ کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ جماعتِ اسلامی اور اخوان کی یہ دو تحریکیں ہی وہ تحریکیں ہیں جن کو اس وقت دنیا بھر کی اسلامی تحریکیں ''حرکتہُ الاُم'' بنیادی تحریکیں یا Mother Movements قرار دیتی ہیں۔ الاستاذ المودودیؒ اور امام حسن البناؒ اس دور کی اسلامی تحریکوں کے دو مسلم رہنما ہیں۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں کی جدید پڑھی لکھی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ کیونکہ جدید تعلیم یافتہ نسل کو ان تحریکوں کے لٹریچر میں اپنے تمام ذہنی سوالات کے جوابات مل گئے، اور انہیں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ اسلام موجودہ دور میں نہ صرف قابلِ عمل ہے بلکہ ان تمام انسانی مسائل کا حل پیش کرتا ہے جن سے جدید دور کے انسانوں کو سامنا ہے۔

نئی نسل کے اس طرح اسلامی تحریک کی طرف لپکنے کی وجہ سے مغرب کی استعماری قوتیں پریشان ہوگئیں۔ ان کی یہ پریشانی ان کے دانشوروں کی نگارشات، ان کے جرائد اور اخبارات، اور ان کی نشریات میں صاف جھلکتی ہے۔ اٹلی کے وزیر خارجہ سے ''نیوز ویک'' کے مشہور جریدے نے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا کہ اب جبکہ معاہدۂ وارسا کے ممالک مغرب کے لیے خطرہ نہیں رہے، تو نیٹو (NATO) کا فوجی معاہدہ کس کے خلاف ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہمیں نیٹو کے بارہ ممالک کے درمیان پائی جانے والی یکجہتی کو برقرار رکھنا ہے تاکہ اگر مستقبل میں مسلمان ممالک یورپ کیلئے خطرہ بنیں تو اس کا مقابلہ کیا جاسکے۔

لندن کے مشہور جریدہ ''اکانومسٹ'' نے ایک مسلمانِ عالمِ دین اور ایک عیسائی پادری کا فرضی مکالمہ شائع کیا، جس میں ''یورپ'' کو آنے والے اسلامی خطرے سے خبردار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امریکہ کے ''ٹائم میگزین'' نے امریکہ کے تین سو ارب ڈالر کے سالانہ دفاعی بجٹ پر بحث کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ روس کی پسپائی کے بعد یہ دیوہیکل دفاعی بجٹ کس کے خلاف ہے، تو اسے بھی مستقبل میں مسلمانوں کا خطرہ نظر آیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کو اس اسلامی دنیا سے کیا خطرہ ہے جو چالیس سے زیادہ ٹکڑیوں میں منقسم ہے، اور یہ چھوٹی ٹکڑیاں بھی آپس میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ بیشتر ٹکڑوں پر ایسی حکومتیں ہیں جو استعماری مصلحتوں کے تابع ہیں۔ ان ممالک کے زیادہ تر وسائل مغربی تہذیب وثقافت کی ترویج اور اسلامی تہذیب کی بیخ کنی پر صرف ہورہے ہیں۔ ان کی معاشی منصوبہ بندی استعماری قوموں کے مفادات کے تابع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خطرہ موجودہ حکمرانوں سے نہیں ہے۔ خطرہ اس سے ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں ایک مضبوط توانا اسلامی تحریک پورے اعتماد اور عزم سے پیش قدمی کررہی ہے۔ اسلامی تحریک نے قربانی کی تاریخ میں ایک لازوال باب کا اضافہ کردیا ہے۔ شوقِ شہادت اور جذبہ جہاد کے بل بوتے پر اس نے افغانستان میں دنیا کی دوسری بڑی جنگی قوت کو پسپائی پر مجبور کردیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مغرب کی استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کررہی ہے اور افغانستان سے روس کے

> ہمیں لٹریچر، تقریر، تعلیم، زبانی گفتگو، جلسے، جلوس، ریلی، نمائش، کیسٹ، ویڈیو، میلے، بازار، گویا تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر کام کرنا ہے

نکلنے کے بعد امریکہ کو قطعاً یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ نئے رنگ میں انہیں غلامی کی زنجیریں پہنا سکیں۔

کشمیر کے مجاہدین نے غلامی کی صدیوں پرانی جکڑ بندیوں کو توڑ دیا ہے۔ وہ، خالص اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر، تھوڑے ہی عرصے میں اتنی زبردست تحریک شروع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ بھارت کو اپنے اٹوٹ انگ کی تقسیم کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ فلسطینیوں نے ''حماس'' کے زیر اہتمام، اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر، انتفاضہ کی تحریک شروع کر دی ہے، اور سیکولرزم کے جال کو توڑ دیا ہے۔ الجزائر اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک کی اسلامی تحریکوں نے نئی آب وتاب پیدا کی ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں سب سے زیادہ امید افزا تبدیلی وسط ایشیا میں آئی ہے۔ ہزاروں مقفل مساجد کو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر کھول دیا ہے۔ مقبوضہ مدارس کو پھر سے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ تازہ تازہ وسط ایشیا سے لوٹنے والوں کا مشاہدہ ہے کہ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی ہیں اور عشاء کے بعد جب بچے مسجدوں میں قرآن سیکھنے کے لیے جاتے ہیں تو تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ یہ اس علاقے کی صورتِ حال ہے جہاں آج سے دس سال پہلے ہمیں چند ایسے مسلمان بھی بڑی تلاش سے ملتے تھے جو روسی زبان میں ترجمہ کیا ہوا ہمارا لٹریچر قبول کرنے کے لیے تیار ہوں[1]

عالم اسلام میں یہ بیداری اچانک بلاسبب وجود میں نہیں آگئی۔ اس کی پشت پر اسلامی تحریکوں کی طویل جدوجہد کارفرما ہے۔ خود اپنے معاشرہ میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس بیداری میں ہمیں اسلامی تحریکوں کے دوش بدوش چلنا ہے۔

اپنے معاشرہ میں ہمارا اصل ہدف کیا ہے؟ مولانا مودودیؒ کے ارشاد کے مطابق، ''انقلابِ قیادت کی جدوجہد'' یعنی ''سیاست'' کوئی عارضہ نہ تھا جو جماعت اسلامی کو قیام پاکستان کے بعد کسی وقت یکا یک لاحق ہو گیا...... میں بلاخوفِ تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دراصل یہی وہ امتیازی وصف ہے جو زمانہ قریب کی تاریخ میں، کم از کم برعظیم ہند کی حد تک، جماعت اسلامی کی تحریک کو دوسری تحریکوں سے ممیّز کرتا ہے۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۸۵-۸۶) دعوت ہو یا تنظیم، تربیت ہو یا اصلاح معاشرہ ''یہ سارے کام کرنے کا فائدہ کیا ہے اگر آپ ان کاموں سے حاصل ہونے والے نتائج کو اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ساتھ ساتھ استعمال نہ کرتے چلے جائیں۔'' (آئندہ لائحہ عمل، ص ۷۰)

آپ خود سوچیے کہ اگر یہ ہدف آئینی وجمہوری ذرائع سے حاصل ہونا ہے، انتخابات کے ذریعہ ہونا ہے تو وسیع پیمانے پر رائے عامہ کو اپنے ساتھ لینے کے علاوہ مقصد تک پہنچنے کا راستہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد ہی وہ عوامی تحریک برپا کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی، جو اس سے پہلے مدھم اور سست مگر مستحکم توسیع کے کام کی خاطر موخر کی جا رہی تھی۔ اب ہمیں اس تحریک کو آگے ہی بڑھانا ہے۔ پیچھے دیکھنے یا پلٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انقلاب کے لیے ہر زمانے میں ذرائع اور مواقع اور حالات کے لحاظ سے مسلسل جدوجہد کی جاتی رہی ہے۔ آج کے حالات کے لحاظ سے بھی ماضی کے ورثہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسی جدوجہد کو ہمیں آگے بڑھانا ہے۔

اس مقصد کے لیے ہمیں لٹریچر، تقریر، تعلیم، زبانی گفتگو، جلسے، جلوس، ریلی، نمائش، کیسٹ، ویڈیو، میلے، بازار، گویا تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر کام کرنا ہے۔ عوام کو اسلامی نظام کی حمایت میں ایک ایسی منظم قوت بنا دینا ہے ''جو دفاع اور ہجوم دونوں کا بل بوتا رکھتی ہو۔'' اس مقصد کے لیے ہمیں زندگی کے بھڑکتے ہوئے مسائل ومعاملات میں دخل دینا ہوگا، اور مخالف تحریکوں اور طاقتوں کے ساتھ زور آزمائی بھی کرنا ہوگی۔ اگر ہم نے ان مسائل میں دخل دینے اور مخالفین کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے گریز کیا تو مطلوبہ تغیر کی رفتار بہت سست رہے گی۔

یہ عوامی تحریک خود ایک دعوتی کام ہے۔ بعض لوگ دعوت کا کام صرف وہ شمار کرتے ہیں جس پر دعوت کا عنوان لگا ہو۔ وہ کام جن پر سیاست یا عوامی تحریک کا عنوان چسپاں ہو، وہ اسے سیاسی ہڑبونگ کے

خانے میں ڈال دیتے ہیں۔اور یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اس عنوان کے تحت دعوت کا بھی کوئی کام ہوا ہے۔مگر مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں،''آپ ہزار کتابیں لکھ کر (یا پڑھ کر) بھی اتنا کام نہیں کر سکتے جتنا اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ جس وقت کوئی اہم مسئلہ لوگوں کے سامنے درپیش ہو اس وقت میدان میں آ کر اس مسئلے میں ان کو صحیح رہنمائی دیں۔''
(آئندہ لائحۂ عمل،ص ۱۲۷-۱۲۸)

ملک کے اندر تحریک کو آج جو بہت بڑا چیلنج درپیش ہے وہ مولانا مودودیؒ کے درج بالا ارشاد کے دوسرے حصہ سے متعلق ہے۔یعنی یہ کہ، پاکستان بننے کے بعد ہم نے ایک مسلم معاشرہ کے عوام میں تحریک برپا کر کے جس حد تک کام کر لیا ہے، اب اس کو کس طرح آگے بڑھائیں کہ اپنی اصل منزل تک پہنچ سکیں؟

۱۹۵۷ء کے لائحۂ عمل کا ایک حصہ یہ بھی رہا ہے کہ ''ہمارے معاشرہ میں جو ایک بچا کھچا صالح عنصر موجود ہے، مگر منتشر ہونے کی وجہ سے یا جزوی اصلاح کی پراگندہ کوشش کرنے کی وجہ سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر رہا ہے، اسے چھانٹ چھانٹ کر ایک مرکز پر جمع کیا جائے، اور ایک حکیمانہ پروگرام کے مطابق اس کو اصلاح و تعمیر کی منظم سعی میں لگا دیا جائے۔'' اور اب تو اس صالح عنصر میں خود ہمارے وابستگان کی ایک کثیر تعداد بھی شامل ہے۔حلقۂ متفقین کا پروگرام اسی غرض کے لیے تھا، لیکن تقریباً ۳۵ سال میں بھی وہ قابل ذکر حد تک عملی جامہ نہیں پہن سکا۔ اب مرکزی مجلس شوریٰ کی طے کردہ پاسبان کی اسکیم بھی بعینہٖ اسی مقصد کے لیے شروع کی گئی ہے۔ہمیں اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کرنا ہے۔

عوامی تحریک کا ایک اہم جز عورتوں کا حلقہ ہے۔وہ ہماری آبادی کا نصف حصہ ہیں۔عورتوں کی راہ سے بگاڑ بھی تیزی سے آ رہا ہے۔ انہی کے ذریعہ اصلاح کی رفتار بھی تیز تر ہو سکتی ہے۔لیکن اس کے لیے ہم کو ایک ہی لگے بندھے طریقے سے کام کرنے کے بجائے حالات کے لحاظ سے موزوں تدابیر وضع کرنا ہوں گی۔

یہ سارا کام جماعت کی تنظیم میں محبت والفت، سمع وطاعت، اور مشاورت واحتساب کے نظام کا متقاضی ہے۔تمسخر، تنابز بالالقاب، بدظنی، تجسس، ہمز، لمز، بلاتحقیق نقل وغیرہ رذائل سے پاک ہو کر چلنا ہو گا۔ایک دوسرے کے لیے عزت، احترام، محبت، الفت اور ذکر خیر کی صفات کو پروان چڑھانا ہو گا۔خدا کا شکر ہے کہ جماعت میں اطاعت، شورائیت اور احتساب کا نظام اپنا کام کر رہا ہے۔لیکن ان اخلاقی فضائل ورذائل کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

تحریکِ اسلامی کے چار نکاتی لائحۂ عمل کا یہ فطری تقاضا ہے کہ جوں جوں عوام ہمارے ساتھ آئیں گے، اور ہم انقلابِ قیادت کی منزل کے قریب پہنچیں گے، اس کی گہما گہمی میں اضافہ ہو گا۔ہمیں عوامی پذیرائی حاصل ہو گی تو مسائل پیدا ہوں گے۔ہمارے مستحکم توسیعی اور تربیتی کام کو اس گہما گہمی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔لیکن اس گہما گہمی سے گھبرانا بھی نہیں چاہیے، کیونکہ ابتدا ہی سے ہم نے ان کے درمیان توازن پیدا کر کے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔اس لیے ہم پوری دلجمعی سے دعوت الی اللہ کا کام کریں، عوام کو ساتھ لائیں، جو لوگ قریب آئیں ان کی وسیع پیمانہ پر دینی اور اخلاقی تربیت کا انتظام کریں، اور انھیں منظم کریں۔پھر اس پوری قوت کو اصلاحِ معاشرہ کے کام پر لگا دیں، اور عوامی بیداری پیدا کر کے انقلابِ قیادت کا راستہ ہموار کریں۔ایک کام کی وجہ سے دوسرا کام ترک نہ کریں۔کاموں میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، تقسیم کار ہو سکتی ہے، دوسرے تنظیمی ڈھانچے بن سکتے ہیں، لیکن لائحۂ عمل کے کسی جز کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔نہ ایسا ہونا چاہیے، نہ یہ غلط مفروضہ قائم کرنا چاہیے کہ اگر عوامی کام ہو رہا ہے تو اس کے متوازی تعمیری مساعی کو ترک کیا جا چکا ہے۔

الحمدللہ ہم پچاس سال سے اس طریق کار کے مطابق اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔منزل جوں جوں قریب آتی ہے، شوقِ منزل بڑھتا ہے اور رفتار میں اضافہ ہوتا ہے۔

تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

☆......☆......☆

عنایت علی خان

مرگ احساس

میں کہتا ہوں کہ لوگو!
کچھ خبر اہل غزہ کی ہے؟
جہاں بارود اور آہن کی بارش میں
فسُردہ باپ اپنے پھول سے بچوں کے لاشے
گود میں رکھے پریشاں ہیں
جہاں پر ماؤں کی ویران آنکھیں
ڈیڑھ گز کپڑے میں لپٹی آرزوئیں
اور تمناؤں کو جاتے دیکھتی ہیں
جہاں پر ہنستے بستے گھر کھنڈر ہیں
اور ان کھنڈرات کے ملبے دبی لاشیں
زبانِ حال سے شکوہ کناں ہیں
اے مسلمانو!
ہمارا تم سے کوئی رشتہ ناتا ہے تو سمجھو
یہ تمہارے اپنے بیٹوں، بھائیوں، بہنوں کے
ماں باپوں کے لاشے ہیں
تو کیا پھر بھی تمہاری بے حسی اور سنگ دل بیگانگی میں
کرب کی ٹیسیں نہیں اُٹھتیں
یہ سوزِ دل میں جب اہل غزہ کی
خوں چکاں فریاد لوگوں کو سناتا ہوں

تو وہ اک بے دلی کے ساتھ کہتے ہیں
کہ وہ تو ٹھیک ہے لیکن
ہمارے اپنے جھگڑے اور بکھیڑے ہیں
ہمیں ان سے نمٹنا ہے
میں کہتا ہوں
اگر دام و دِرَم سے
بے کسوں کی
کچھ مدد تم کر نہیں سکتے
تو کم سے کم
دُعا کے واسطے ہی ہاتھ پھیلا دو
تو چہروں پر عجب سنگین سی
اک مسکراہٹ لا کے کہتے ہیں
شہیدوں کو دعائے مغفرت کی کیا ضرورت ہے!

غزل

ستم ایجاد ہوتا جا رہا ہے
یہ گھر برباد ہوتا جا رہا ہے

گماں کی زد پہ آ پہنچی ہے بستی
یقیں الحاد ہوتا جا رہا ہے

پرندے شاخ پر سہمے ہوئے ہیں
چمن جلّاد ہوتا جا رہا ہے

اجڑتی جا رہی ہے میری دُنیا
عدم آباد ہوتا جا رہا ہے

گریباں چاک ہوتے جا رہے ہیں
جنوں ایزاد ہوتا جا رہا ہے

جو مُردہ باد ہونا چاہیے تھا
وہ زندہ باد ہوتا جا رہا ہے

جو اِک حرفِ دعا تھا میرے لب پر
وہ اب فریاد ہوتا جا رہا ہے

کرامت بخاری

غزل

دیارِ غیر کی تنہائیاں نہ پوچھ اے دل
قدم قدم پہ یہ رسوائیاں نہ پوچھ اے دل

کبھی تھا اپنے چمن میں بہت غرور مجھے
چلی گئیں کہاں انگڑائیاں نہ پوچھ اے دل

کہاں کہاں مجھے پہنچاتی ہیں اُڑاتی ہیں
تصورات کی پُروائیاں نہ پوچھ اے دل

بڑے عجیب ہیں نغمات ان ریالوں کے
ہیں کس غضب کی یہ شہنائیاں نہ پوچھ اے دل

شہودؔ بھول نہ جائے کہیں شناخت اپنی
ہیں کیسی وقت کی پرچھائیاں نہ پوچھ اے دل

شہود ہاشمی

حفصہ محمد افضال

بی بی سواری

''اسٹوڈنٹس فزکس کو بہت ٹف سبجیکٹ کنسیڈر کرتے ہیں۔ کچھ کو یہ انتہائی خشک سبجیکٹ لگتا ہے...... بہت روکھا پھیکا سا......لیکن ان فیکٹ ایسا ہے نہیں۔ آپ فزکس کو انٹرسٹ لے کر پڑھیں یہ آپ کو بہت انٹرسٹنگ لگے گی''۔

آج بی ایس آنرز تھرڈ سمیسٹر کے اسٹوڈنٹس کی مکینکس کی پہلی کلاس تھی اور چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کے حامل پروفیسر کامران انتہائی دلجمعی کیساتھ اسٹوڈنٹس سے مخاطب تھے۔

''انسان میں بس کچھ سیکھنے کی لگن ہونی چاہیے اس کے بعد کچھ مشکل نہیں رہتا۔ پھر فزکس کی ٹرمز آپ کی عمومی زندگی میں اپلائی ہوتی ہیں سرکس، فوسبری ٹیکنیکس، اولمپکس...... یہ سب کیا ہے؟ فزکس ہی تو ہے۔

کلاس روم کا دروازہ زور سے چرچرایا۔ قدموں کی چاپ پہ پوری کلاس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آنیوالا ہر نظر سے بے نیاز، داہنی جانب بنے لیب اسسٹنٹ کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

''بلکہ یہ تو تھوڑی دور کی بات ہے۔ آپ لوگ کہیں گے کہ سر ہمیں کیا پتہ اولمپکس یا فوسبری ٹیکنیکس کا......'' پروفیسر کامران نے آنے والے پہ ایک اچٹتی مگر جانچتی ہوئی نظر ڈال کر اسٹوڈنٹس کو پھر سے متوجہ کیا۔

یا موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا بازی گر کیا جانے سینٹری پیٹل فورس یا ایکوی لبریم کو۔ اُسے تو جو سکھا دیا اس نے blindly سیکھ لیا۔ اُسے ایسی کوئی definition نہیں رٹائی گئی کہ "sum of torques acting on a body should be equal to zero"۔ تو چلیے میں آپ کو ایک قریبی مثال دیتا ہوں جو ہر کامن مین آبزرو کرتا ہے آج سائنس نے ثابت کر دیا کہ زمین ساکن نہیں ہے۔''

''ایکسکیوز می سر! میں یہاں سے گزر سکتی ہوں؟ ایکچوئیلی مجھے لیب اٹینڈنٹ سے کچھ کام ہے۔'' آہستگی سے دستک دے کر نیوکلیئر کی میم علیزہ اندر داخل ہوئیں جو اپنے Interrupt کرنے پر خاصی شرمندہ دکھائی دے رہی تھیں۔

''جی مِس! ضرور گزریئے'' مسکراتے ہوئے پروفیسر کامران کا لہجہ بہت شائستہ تھا جو اپنی کلاس کے دوران ہلکی سی ڈسٹربینس بھی برداشت نہیں کیا کرتے تھے۔ مِس علیزہ تشکر بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے گزر گئیں تو انہوں نے پھر سے سلسلہ کلام جوڑا۔

''ہاں تو میں بات کر رہا تھا کہ آج سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ زمین بھی دوسرے بہت سے سیاروں اور ستاروں کی طرح محو گردش ہے اور اس گردش کو آپ لوگ خود آبزرو کر سکتے ہیں۔ آپ کبھی خود کو بالکل ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ جائیں...... بالکل ریلیکس پوزیشن میں...... کچھ دیر کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ ہلکا ہلکا ہل رہے ہیں۔ یہ موومنٹ زیادہ تر بیک اینڈ فورتھ ہو گی (آگے پیچھے)، ٹو اینڈ فرو (اِدھر اُدھر) نہیں......'' انہوں نے رُک کر تائید طلب نگاہوں سے طلباء کو دیکھا۔ سب متفق دکھائی دے رہے تھے۔

یہ تو بات ہوگئی ایک کامن مین کی، جسے بس اسی قدر سمجھا دینا کافی ہے لیکن ایک فزکس کے اسٹوڈنٹ کا exposure عام آدمی سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ ایک سائنس دان کی آنکھ ہوتی ہے اور کائنات کو جاننے کی مسلسل کھوج یہ پردہ اٹھاتی ہے کہ ہمارے ہلنے کے پیچھے بھی ایک فورس کارفرما ہے جسے pseudo force (سوڈو فورس) کہا جاتا ہے۔''

دروازہ ایک دفعہ پھر دھاڑ سے کھلا۔ کلف لگے کپڑوں میں ایک دفعہ پھر وہی شخص داخل ہوا جو پندرہ منٹ قبل آیا تھا۔ اسی بے نیازی کی اجرک اوڑھے، اب کی بار پھر اس کا رُخ لیب اسسٹنٹ کے کمرے کی طرف تھا۔ ناگواریت کی ایک لہر پروفیسر کامران کی رگ رگ میں دوڑ گئی......

''حضرت بات سنیے......''

بڑھتے قدم تھم گئے۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''خاور......'' ہونٹ اچنبھے سے کھلے اور بند ہو گئے۔

''کیا کام کرتے ہو یہاں؟''

''سر! کمپیوٹر لیب میں ہوتا ہوں'' اکڑی ہوئی گردن' اکڑا ہوا لہجہ......

''کتنے عرصے سے ہو، یہاں......؟''

ایک اور سوال......خاور کے ماتھے پر ناگواریت نے شکنیں بُنیں۔

''جی تقریباً پانچ سال سے......''

''پانچ سالوں میں کسی نے ایک دفعہ بھی آپ کو یہ نہیں بتایا کہ جب کلاس ہو رہی ہو تو بیچ میں بار بار کی ''حاضری'' سے ڈسٹرب نہیں کیا کرتے؟ اور اگر بالفرض کسی ضروری کام سے آنا پڑ ہی جائے تو اجازت لے کر آتے ہیں......'' بات کرتے ہوئے ان کا دایاں ابرو تن گیا۔

''یوں بھی آپ کسی پرائمری سکول کے چپڑاسی تو ہیں نہیں جسے یہ بات بھی سکھائی جائے'' وہ جب بے عزتی پر آتے تھے تو کسی بھی قسم کا لحاظ نہیں برتتے تھے۔ خاور کے ہونٹ بھنچ گئے۔ لہورنگ آنکھوں سے وہ مسلسل پروفیسر کامران کو گھورے چلے جا رہا تھا جسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

''جا سکتے ہیں آپ...... اور آئندہ احتیاط کرنا، کم سے کم میری کلاس میں......'' انہوں نے ''میری'' پہ زور دیتے ہوئے انگشت شہادت اپنے سینے پہ رکھی۔

اور خاور نے زوردار انداز ے سے دروازہ بند کر کے گویا یہ باور کروانا چاہا کہ وہ کسی پرائمری سکول کا ''چپڑاسی'' ہرگز نہیں ہے جس کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جائے۔ پروفیسر کامران نے کیپ چڑھا کر مار کر ڈائس پر اُچھال دیا۔ ''آپ نے نوٹ کیا ہے؟'' انہوں نے بالوں میں اُنگلیاں چلاتے ہوئے اسٹوڈنٹس کو مخاطب کیا۔

''یہ جو ''چھوٹے لوگ'' ہوتے ہیں نا، ان میں کوئی ادب آداب نہیں پائے جاتے۔ انہیں دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کس کلاس سے belong کرتے ہیں۔ ابھی آپ کی میم بھی آئیں، وہ اجازت لے کر گزریں اور یہی proper way ہے۔ ہر جگہ منہ گھسا کر نہیں گھسے چلے جانا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے ایجوکیٹڈ اور ان ایجوکیٹڈ میں فرق تو ہوتا ہے'' انہوں نے سر جھٹکتے ہوئے گویا خود کو تاویل دی۔

''اینی ویز...... آج ہمارا ٹاپک سوڈوفورس کا ہی تھا۔ میرا موڈ تو تھا کہ اس پر مزید کچھ بات کرتا لیکن اب چونکہ tempo ٹوٹ گیا ہے اس لئے اسے وائنڈ اپ کریں۔ یوں بھی آج تو اِنٹرو کی کلاس تھی۔ کل سے آپ کے باقاعدہ لیکچرز سٹارٹ ہو جائیں گے۔ سو......سی یو ٹو مارو...... انشاءاللہ۔

انہوں نے ڈائس کے اوپر رکھی holiday Resnick Krane کی کتاب اُٹھائی اور کلاس سے نکل گئے۔

اسٹوڈنٹس گویا ان کے جانے کے ہی منتظر تھے ان کے کلاس روم سے نکلنے کی دیر تھی کہ مختلف چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔

دِن کے دَس بج چکے تھے۔ کیمپس کی رونقیں اپنے عروج کو پہنچ گئی تھیں۔ گھاس کے بڑے بڑے قطعے جن کے اطراف میں لگے پودوں کو انتہائی نفاست کیساتھ تراشا گیا تھا، سورج کی تیز پھوار کی صورت برستی سنہری کرنوں میں بادل نخواستہ نہا رہے تھے۔ پتوں پر ٹھہرے شبنمی قطرے کوئی نقش چھوڑے بنا سوکھ چکے تھے۔ وہ تینوں کاندھے پر بیگ لٹکائے ڈیپارٹمنٹ سے نکل آئی تھیں۔ تاحد نگاہ نیلے آسمان کی گہری وسعتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جہاں بینائی کی حد ختم ہوتی تھی وہاں آسمان زمین پر جھک آتا تھا۔ گویا اپنی نیلاہٹیں زمین کے خاکی بدن پر اتارنے کی کوشش میں ہو۔

انہوں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے عین سامنے موجود گول قطعے کے اطراف میں بنی گزرگاہ سے ایک لمبا چکر کاٹا اور مرکزی ٹریک پر آ گئیں۔ وہ ایک خاصا چوڑا ٹریک تھا جس کے درمیان میں ڈیوائیڈر بنا کر اسے دو راستوں میں بدل دیا گیا تھا۔

ستمبر کا اواخر تھا۔ سورج تیز شعاعوں کو، قطروں کی صورت اپنی اوک میں بھر بھر کر لٹاتا تھا۔ جو اس کی اوک سے جدا ہوتے بھی چبھتی دھوپ میں بدل جاتی تھیں اور زمین زادوں کے وجود پر پڑتے ہی پھر سے قطروں کی صورت ڈھل جاتی تھیں۔

اُن کا رُخ کیمپس کے مغربی جانب بنے ایڈمن آفس کی طرف تھا۔ اگلی کلاس کے شروع ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا اور انہیں رجسٹریشن کے سلسلے میں ایڈمن آفس میں کچھ کام تھا۔ جسے وہ اسی ڈیڑھ گھنٹے کے دوران نبٹا لینا چاہتی تھیں۔

''یار خاور کی اچھی ہوئی آج......'' بیگ کی سائیڈ پاکٹ سے چیونگم نکال کر منہ میں ڈالتے ہوئے ہُما کھلکھلائی تھی۔

''ہاہاہا...... ایمان سے ایسا ٹام کروز بنا پھرتا ہے۔ آج تو شکل دیکھنے والی تھی اسکی......'' ہما کی بات پر الشبہ نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔

''پھر بھی ایٹی ٹیوڈ دیکھا تھا اُس کا؟ نان سینس...... کیسے دھاڑ سے دروازہ بند کر کے گیا تھا۔'' ہما نے ہاتھ میں پکڑا چیونگم کا ریپر یوں غصے سے چرمر کر کے ایک طرف اچھالا گویا وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا نہیں بلکہ خاور کا سر ہو۔ ڈیوائیڈر کے ساتھ پڑے ٹریش بِن نے انتہائی مایوسی کیساتھ سیاہ سڑک پر گرے اس نیلے ریپر کو دیکھا تھا۔

''صحیح بات ہے یار واقعی سر نے ٹھیک کہا۔ یہ جو ''چھوٹے لوگ'' ہوتے ہیں نا، ان میں کوئی مینرز نہیں ہوتے...... اپنا آپ دِکھانے سے باز نہیں آتے یہ...... چھوٹے، بڑے کی کوئی تمیز نہیں، کوئی ریسپکٹ نہیں...... اب تم لوگ اس خاور کو ہی دیکھ لو...... دیکھنے تک کی تمیز نہیں ہے اسے......'' ہُما کو خاور پہلی دفعہ اپنی نظروں کی وجہ سے ہی سخت زہر لگا تھا۔

بھینگی آنکھوں والا، چوسنی نہ ہو تو، کریلے کے منہ والا...... یہ وہ اعزازات تھے جن سے وہ دِن میں بلا مبالغہ بیسیوں دفعہ نوازا جاتا تھا۔

''نہیں خیر مجھے تو کچھ اچھے نہیں لگے سر کے کمنٹس......'' سورج کی تپش اب جھلسانے لگی تھی۔ کب سے خاموش چلتی فرح نے اسٹوڈنٹ فائل اپنے سر پر رکھتے ہوئے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیا۔ یہ سورج کی حدت سے بچنے کا ایک نامحسوس طریقہ تھا۔

''خاور نے جو کیا وہ برا تھا لیکن جو سر نے کیا وہ بھی برا ہی تھا۔ اگر وہ اِل مینرڈ ہے تو سر نے بھی کوئی مینرز شو نہیں کیے......'' اُس نے قطعیت سے کہا۔

''کسی کو بھی پوائنٹ آؤٹ کرنے کا یا سمجھانے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا، یہ بات سر اسے کلاس کے بعد ہی سمجھا سکتے تھے'' اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ نجانے یہ آسمان کی چھلنی سے چھن چھن کر گرتے اور ریت کی طرح جسم پر چبھتے دھوپ کے ذروں کا اثر تھا یا پھر ایسا جذباتیت کے تحت ہوا تھا۔ اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اُس کی بات پر الشبہ اور ہُما کے منہ بن گئے۔

''کلاس کے بعد کہاں ملتا وہ اُنہیں؟'' الشبہ نے دایاں ابُرو چڑھا کر اسے دیکھا گویا کہہ رہی ہو ''دماغ سیٹ ہے؟''

''تو اس وقت اُسے کلاس کے بعد ملنے کا کہہ سکتے تھے لیکن یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آپ کسی کی اس طرح پوری کلاس کے سامنے تذلیل کریں۔ ہر شخص کی عزت نفس ہوتی ہے بھلے کوئی ''چھوٹا'' ہو یا بڑا......'' اُس نے بالخصوص ''چھوٹے'' پر زور دیا۔ اشارہ کیا تھا وہ دونوں سمجھتی تھیں۔

''تو انسان اس طرح کے کام ہی نہ کرے نا اگر اتنی ہی عزت نفس مجروح ہوتی ہے تو......'' اب کے ہُما نے بے حد تلخی سے کہا۔ جسے خاور کی مسلسل کی جانے والی حمایت وہ بھی فرح کی زبان سے، سخت بری لگ رہی تھی۔

''شاید اس نے کبھی اُس کی گندی نظریں نہیں دیکھیں'' اُس نے بے اختیار دِل میں سوچا۔

''پھر وہی بات......'' فرح بے طرح زچ ہوئی۔ ''یار ہم لوگ لیب میں کلاس لے رہے تھے اور لیب اسسٹنٹ کا روم اُدھر ہی ہے۔ ان سے کسی کو بھی کام پڑ سکتا ہے'' دلیل خاصی مضبوط تھی۔

''ہاں بالکل پڑ سکتا ہے لیکن جب نظر آ رہا ہے کہ اندر کلاس ہو رہی ہے تو اجازت لے کر بھی گزرا جا سکتا ہے۔ بلکہ اجازت لے کر ہی گزرنا چاہیے'' الشبہ نے ''ہی'' پر زور دیا۔ اسے بھی فرح کے خاص حمایتی جملے سخت تپا رہے تھے آج سے پہلے اس نے اس کی ایسی حمایت کبھی کی بھی تو نہیں تھی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ مان لیا کہ اُس کی غلطی تھی؟...... عادت کے مطابق بات کرتے ہوئے اس کا دایاں ہاتھ مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ ''اور یہ بھی درست ہے کہ سر نے اُسے ٹوک دیا۔ لیکن ٹوکنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے کہ نہیں؟ یوں بھری کلاس میں سب کے سامنے کسی کو کہنا کہ......

''تم پرائمری سکول کے چپڑاسی تو ہو نہیں'' اُس نے سر کامران کا جملہ دُہرایا۔ کسی نے ماننا بھی ہو گا تو ایسا لہجہ سن کر نہیں مانے گا۔ پھر بعد میں جو سر نے کہا...... چھوٹے لوگ...... یار! ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کسی کا بھی یوں تمسخر اُڑانے کا؟''

فرح کا چہرہ مزید سُرخ ہو چکا تھا۔ پروفیسر کامران کی کہی ہوئی باتیں اُسے کس قدر بری لگی تھیں۔ یہ اُس کے لفظ لفظ سے عیاں تھا۔

''تمسخر نہیں اُڑایا تھا، فیکٹ بیان کیا تھا'' دوسری طرف بھی

تا حال وہی تلخی تھی۔ وہ بھی ہُما یعقوب تھی۔ زندگی گزارنے کے اصولوں میں مینرز کو سب سے ٹاپ پر رکھنے والی...... وہ اکثر کہا کرتی تھی۔ ''اخلاقیات انسان کا شناختی کارڈ ہوتے ہیں۔ سو ان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ان کے کھونے کا مطلب ہے گویا آپ کا ''انسان'' ہونا ہی مشکوک ہو گیا''

''فیکٹ......سونہہ'' فرح نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ ''اس کا فیکٹ بیان کیا تھا یا اپنا؟''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' ہُما چلتے سے رُک گئی۔ تیکھا لہجہ، تیکھے تیور...... ''رُکو نہیں، چلتے چلتے بھی بات ہو سکتی ہے۔ ابھی خاصا فاصلہ طے کرنا ہے'' فرح نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے کو دھکیلا۔ وہ پھر سے چلنے لگی لیکن چہرے کے زاویے بگڑ چکے تھے۔

''سیدھا سا مطلب ہے کہ دُنیا میں سارے انسان برابری کی سطح پر اُتارے گئے ہیں۔ کوئی چھوٹا یا کوئی بڑا نہیں اُتارا گیا نہ ہی تو کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت دی گئی ہے اور نہ ہی کسی عربی کو کسی عجمی پر۔ جب کہنے والے نے کہہ دیا تو ہم کون ہوتے ہیں اپنی assumptions دینے والے''۔

''اس میں assumptions دینے والی کوئی بات نہیں ہے فرح......''

اس سے پہلے کہ ہُما کچھ کہتی اور یقیناً برا کہتی الشبہ جلدی سے بول اُٹھی ''نہ ہی یہاں چھوٹے بڑے سے مراد کوئی کالا گورا یا عربی عجمی ہے...... یہاں بات ماحول کی ہے۔ دیکھو کچھ چیزیں ہمارے معاشرے کی اٹل حقیقت ہیں۔ جن سے ہم لاکھ کوشش کے باوجود بھی نظریں نہیں چرا سکتے۔ انسان کا اردگرد کا ماحول اُس پر بہت حد تک اثر انداز ہوتا ہے بلکہ ماحول ہی انسان بناتا ہے''۔

بات بگڑ نہ جائے، اس احساس سے اس کا لہجہ بہت نرم تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ پیچھے مُڑ مُڑ کر بھی دیکھتی جا رہی تھی تا کہ جیسے ہی شٹل سروس آئے وہ اس پر سوار ہو جائیں۔

''انسان کی تربیت اس کا ماحول کرتا ہے۔ ''چھوٹے لوگوں'' سے مراد نچلے درجے کے کام کرنے والے یا دوسرے الفاظ میں لوئر کلاس ہے اور لوئر کلاس میں زیادہ تر...... زیادہ تر...... تہذیب، ادب آداب، تمیز، طریقہ نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ نا کہ انسان کی فطرت نہیں بدلتی تو بس یہی بات ہے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ بھلے کتنی ہی تعلیم کیوں نہ حاصل کر لیں وہ جو چھاپ لگ جاتی ہے نا وہ نہیں جاتی کسی نہ کسی طرح سے اپنا آپ دکھا ہی دیتے ہیں''۔

''ایگزیکٹلی......'' ہما نے فوراً الشبہ کی تائید کی۔ ''یہی میرا مئوقف ہے اور یقیناً سر کامران کا بھی......انسان کو ایک نظر دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ اس کا تعلق کس قبیل سے ہے......''

''جبکہ یہ مئوقف سراسر غلط ہے اور جہاں تک تعلیم کی بات ہے تو تم یہاں کم سے کم ایجوکیشن کو تو مت لے کر آؤ'' دائیں ہاتھ کی مدد سے سر پر ٹکائی فائل کو بائیں ہاتھ سے سہارا دیتے ہوئے اس نے انتہائی ناگواری سے الشبہ سے کہا۔ ''کیونکہ جہاں تک میں سمجھتی ہوں اصل بات انسان کے اندر کی ہوتی ہے۔ جب تک آپ کے اندر کچھ کر گزرنے کا احساس نہیں جاگتا، کوئی تعلیم آپ کو کچھ نہیں سِکھا سکتی۔ علم گھول کر نہیں پلایا جا سکتا۔ ہر انسان کی اپنی ایبلٹی ہوتی ہے کہ وہ ایجوکیشن سے کیا حاصل کرتا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ ''علم سے شریف کی شرافت اور رذیل کی رذالت میں اضافہ ہوتا ہے'' اور ایجوکیشن صرف کتابیں پڑھ کر حاصل نہیں ہوتی یا ڈگریاں کسی کی قابلیت کی علامت نہیں ہوتیں بلکہ بہترین علم اور تجربہ وہ ہے جو ہم اپنے اردگرد کے معاشرے سے حاصل کرتے ہیں''۔

''تو ہاں نا وہی تو...... یہاں بات آ گئی نا کلاس کی، آپ کی سوسائٹی کی...... جسے تم نے اپنی بات سے خود ثابت کیا ہے کہ کلاس اہم ہے اور آپ کو آداب آپ کا ماحول سکھاتا ہے......اور مینرز ہی ہیں جو......''

''میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا......'' اُس نے جلدی سے ہُما کی بات کاٹ دی۔ کیونکہ جہاں تک ''مینرز'' کی بات ہے تو وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ بعض مرسڈیز میں گھومنے والے اور منرل واٹر پینے والے......مینرز کی ابجد سے بھی ناواقف ہوتے ہیں''۔

ایک تو گرمی بہت شدید تھی۔ اوپر سے شٹل کا کہیں دور دور تک بھی نام و نشان نہیں تھا۔ اس پر فرح کی ایک سے بڑھ کر ایک دلیل...... ہُما کا پارہ پھر سے چڑھنے لگا۔

''تم نے کبھی لوکل بسز میں سفر کیا ہے؟ نہیں، کبھی نہیں کیا ہوگا''
اس نے خود سوال کیا پھر خود ہی جواب دیا۔ فرح ناز کا شمار مرسڈیز میں گھومنے والے اور منرل واٹر پینے والوں میں ہی ہوتا تھا۔

''لیکن میں نے کیا ہے...... ایک دفعہ سخت مجبوری کے تحت سواریوں سے کھچا کھچ بھری ٹرانسپورٹ کی خواری جھیلنی پڑی تھی مجھے......تم یقین جانو غریب عورتیں بچوں کی فوج سمیت بس کا ڈنڈا پکڑے کھڑی رہتی ہیں لیکن سامنے بیٹھے تماش بین مردوں میں سے کسی کے دل میں بھی احساس کی چنگاری نہیں سُلگتی کہ اُس مسکین کے بیٹھنے کیلئے جگہ ہی خالی کر دی جائے...... جوان لڑکیاں لوفر لڑکوں کی قطار میں بے بسی کی تصویر بنی کھڑی رہتی ہیں لیکن کسی کی غیرت بیدار نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اگلی سیٹ سے کنڈیکٹر کی آواز آتی ہے......''بھا جی! بی بی سواری اے۔ جگہ دے دیو'
(بھائی صاحب! زنانہ سواری ہے جگہ دے دیں) اس اپیل پر بمشکل اور کنڈیکٹر کے زور دینے پر جگہ خالی کی جاتی ہے لیکن ہزار ناک بھوں چڑھانے کے بعد......اب تم خود بتاؤ کہ ایسے ماحول میں اُٹھنے بیٹھنے والے لوگ جہاں عورت کو ہاتھ لگانے سے بڑا کوئی اور چارم دکھائی نہیں دیتا اپنے اِردگرد سے کیا سیکھتے ہوں گے اور کس قسم کی تربیت کے مالک ہوں گے؟ تلخ لہجہ، تلخ الفاظ، معاشرے کی تلخ حقیقت......

''پانی پی لو۔ پہلے تم کہیں کی سقراط......'' الشبہ نے پانی کی بوتل اس کی جانب بڑھائی تو اس کی تیز تیز چلتی زبان کو بریک لگے۔ واقعی حلق سوکھا پڑ رہا تھا۔

''دیکھو ہُما! یہ خرابیاں صرف لوئر کلاس کا حصہ نہیں ہیں بلکہ یہ ہمارے پورے معاشرے کا المیہ ہیں......'' فرح نرم لہجے میں بولی۔ ہار ماننے والوں میں تو اس کا بھی شمار نہیں ہوتا تھا لیکن وہ ہُما کی نسبت بہت نرم خو تھی۔ ''مڈل کلاس ہو یا ایلیٹ کلاس......''

''شٹل آ رہی ہے......'' الشبہ زور سے چلائی۔ فرح کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ باقی دونوں نے ایک جھٹکے سے اس کی آواز کے تعاقب میں پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ قریب تھا کہ گاڑی زن کرتی ان کے پاس سے گزر جاتی کہ ان تینوں نے جلدی سے ہاتھ دیا۔ اسپیڈ میں آتی گاڑی کے ٹائر چرچرا اُٹھے۔ الشبہ نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ساکت کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہے؟ اب چڑھو بھی......'' پیچھے سے فرح نے بے طرح جھنجھلا کر کہا۔ ایک تو اللہ اللہ کر کے شٹل آئی تھی اوپر سے یہ تاخیر...... کیسے برداشت ہوتی۔ یار جگہ نہیں ہے اندر......'' الشبہ کی آواز میں واضح مایوسی تھی۔ ''تم چڑھو تو، جگہ بھی بن جائیگی'' الشبہ کے منانے پر ہُما نے پیچھے سے ٹہوکا دیا۔ ہاتھ آئی سواری وہ جانے نہیں دینا چاہتی تھیں اور کچھ نہ سہی، دھوپ سے بچنے کیلئے کوئی سائبان تو میسر آتا۔ سونا چار الشبہ نے اندر قدم رکھ دیئے۔ پیچھے پیچھے ہما اور فرح نے بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے تقلید کی۔ ایک تو ایڈمن اللہ میاں کے پچھواڑے جا کے تھا۔ اوپر سے یہ غضب کی گرمی......وہ تینوں ہی پسینہ پسینہ تھیں۔

اندر بی بی اے کے دس، بارہ اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ سب کے سب بلیک سوٹ پہنے، اہتمام سے ٹائیاں لگائے۔

یقیناً گیسٹ ہاؤس میں کسی دعوت شیراز کا انتظام تھا اور شٹل سروس انہوں نے خاص طور پہ فون کر کے ہی منگوائی تھی۔

وہ تینوں بیگ سنبھالتی، بمشکل سیٹوں کے درمیان کھڑی ہوگئیں، لیکن اس طرح کہ ان کے سر سیدھے نہیں ہو پا رہے تھے۔ ان کے سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے ایک دفعہ پھر سے شٹل دوڑا دی۔

اندر موجود اسٹوڈنٹس نے کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرنے شروع کر دیئے۔ کچھ تو باقاعدہ ٹہوکے دینے لگے۔ وہ یقیناً ایک دوسرے کو اُن تینوں کیلئے جگہ خالی کرنے کا کہہ رہے تھے، لیکن سوٹ ٹائی پہنے معاشرے کے ان بظاہر ''پڑھے لکھے'' نوجوانوں میں اتنی اخلاقیات نہیں تھیں کہ وہ خود کھڑے ہو کر اُن کیلئے جگہ چھوڑ دیں۔ ڈرائیور بھی گاڑی دوڑانے میں محو تھا۔ اس کیلئے یہ روز کا بلکہ ہر دوسری گھڑی کا معمول تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے نگاہ چراتی مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھتی رہیں۔ یہاں تک کہ ایڈمن آ گیا۔

شٹل کے رُکتے ہی انہوں نے باہر چھلانگیں لگا دیں۔ گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔ فرح نے ایک مسکراتی نگاہ ہُما پر ڈالی۔ ''لو بھئی ہُما...... اِن ایجوکیٹڈ اور بظاہر معاشرے کے ''کلچرڈ'' لوگوں سے بہتر تو تمہارا وہ گنوار لوئر کلاس کنڈیکٹر ہی ہے جو کسی عورت کو کھڑے دیکھ کر کم سے کم یہ تو کہتا ہے ''بھا جی! بی بی سواری اے......جگہ دے دیو''۔

☆......☆......☆

روبینہ عاطف

کاش ایسا ہو!

''ارے تم پھر پڑھائی سے اٹھ آئیں'' بارہ سالہ فریحہ کو کچن میں دیکھتے ہی امی جان نے تلملا کر کہا۔

''وہ......وہ امی پیاس لگ رہی تھی پانی پینے آئی تھی''۔

حد ہوگئی پڑھائی شروع ہوتے ہی تمہیں بھوک، پیاس، پیٹ کا درد، کان کا درد غرض تمام ضروریات اور تکالیف یاد آ جاتی ہیں۔ جب تک سر پر ڈنڈا لے کر نہ بیٹھو تم سے پڑھائی نہیں ہوتی۔ گھر کے کام کروں یا تمہارے سر پر بیٹھی رہوں۔'' امی جان کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''میرا کام ختم ہو گیا'' سلاد فریج میں رکھتی بڑی بہن فرزین نے کہا۔ ''میں نے کالج کے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے میں اسے ساتھ بٹھا لیتی ہوں''۔ اس نے صورتحال کو سنبھالتے ہوئے کہا اور روتی منہ بسورتی فریحہ کو کمرے کی طرف لے گئی۔

''پتہ نہیں امی جان ہر وقت ڈانٹتی کیوں رہتی ہیں''۔ سوں سوں کرتی فریحہ نے کہا۔

''ہر وقت تو خیر نہیں ڈانٹتی'' فرزین نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''جب کوئی بات نہ مانے یا تنگ کرے تو سبھی بڑے ڈانتے ہیں۔''

''بڑے ڈانتے کیوں ہیں؟ مجھے ڈانٹ بہت بری لگتی ہے۔ فریحہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

''کبھی کبھار ڈانٹ اچھی ہوتی ہے'' فرزین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'''ڈانٹ! اچھی! وہ بھلا کیسے!'' فریحہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو جب تمہیں پتہ ہوتا ہے کہ اگر یہ کام نہ کیا تو ڈانٹ پڑے گی تو تم وہ کام اچھے طریقے سے اور جلدی کرتی ہو نا؟

''ہاں کرتی تو ہوں''۔ ''تو ڈانٹ تمہیں چست رکھتی ہے۔ اس لئے اچھی ہوئی''۔

دونوں باتیں کرتی کمرے میں داخل ہوئیں جہاں منجھلی بہن سیما کتاب کھولے گم سم بیٹھی تھی۔

''کہاں کھوئی ہو؟'' فرزین نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

''کہیں نہیں بس یونہی میں کچھ سوچ رہی تھی۔''

''ہائیں تم سوچتی بھی ہو؟'' فرزین نے چڑاتے ہوئے کہا۔

''حد ہوگئی آپی میں اتنی سنجیدہ بات پر غور کر رہی تھی اور آپ مذاق اڑا رہی ہیں''۔

''او ہو بھئی ایسی کیا بات ہے جس نے تمہیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔''

میں سوچ رہی تھی کہ ہم لوگ نجانے ''مردہ پرست'' کیوں ہیں''۔

''مردہ پرست فریحہ نے حیرانگی سے دہرایا۔ توبہ توبہ اللہ معاف کرے۔ ویسے بت پرست اور آتش پرست تو میں نے سنا تھا یہ مردہ پرست کیا چیز ہے اس نے حیرانی سے پوچھا''۔

''یہ میرے ذہن کی اختراع ہے''۔

''اب اس کا مطلب بھی بیان کر دیں اور آپ کے ذہن میں آئی کیوں یہ بھی بیان فرما دیں''۔ فرزین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس دن سلمیٰ خالہ اپنی جیٹھانی کی وفات پر بہت رو رہی تھیں۔ سلمیٰ خالہ کا خاندان ان کے پڑوس میں تھا۔ تین بھائیوں کے خاندان 15 سال سے ایک ہی گھر میں مل جل کر رہتے تھے۔ سلمیٰ خالہ کا نمبر دوسرا تھا۔ پچھلے ہفتے اچانک ان کی جیٹھانی کا فشار خون بڑھ گیا۔ ہسپتال لے جاتے ہوئے راستے ہی میں وفات پا گئیں۔ ان کی اچانک وفات نے خاندان ہی کیا پورے محلے کو اداس کر دیا۔''

''بھئی اگر وہ رو رہی تھیں تو اس میں ''مردہ پرست'' ہونے والی کیا بات ہے۔ ظاہر ہے ہر انسان اپنے مرحوم رشتے دار کو یاد کر کے جذباتی ہو جاتا ہے۔ اور ان کی تو وفات بھی اتنی اچانک ہوئی صدمہ تھا ہی اتنا بڑا۔''

''وہ بات تو ٹھیک ہے لیکن آپ کو معلوم ہے نا سلمیٰ خالہ جہاں

کہیں بیٹھتی تھیں اپنی جیٹھانی کے بارے میں گلے شکوے ہی کرتی تھیں کے سارا خرچ ان کے حوالے ہے میں تو اپنے بچوں کو اپنی مرضی سے کھانا یا دودھ بھی نہیں دے سکتی۔ گڑیا (انکی چھوٹی بیٹی) کو ہمیشہ بچے ہوئے کپڑوں کے فراک بنا کر پہناتی ہیں آج تک کوئی ریڈی میڈ فراک خرید کر دینے کی توفیق نہیں ہوئی''۔

''ہاں یہ تو وہ اکثر ہی کہا کرتی تھیں۔ تو پھران کی وفات پر وہ ان خامیوں کو خوبیوں کی طرح بیان کر رہی تھیں''۔

''وہ بھلا کیسے؟'' فریحہ نے حیرانی سے پوچھا۔

کہہ رہی تھیں ''ہائے آپا...... آپ چلی گئیں اب میرے بچوں کو کھانا کون کھلائے گا...... ہائے میں تو سو رہی ہوتی تھی تو آپ بچوں کو دودھ بنا کر دیتی تھیں، کتنا خیال رکھتی تھیں...... ہائے آپا اب گڑیا کو نت نئے فراک کون بنا کر پہنائے گا...... ہائے لوگو میں کیا کروں گی......!!'' ہے نا عجیب بات! ہم لوگ جب کوئی زندہ ہو تو قدر نہیں کرتے، مر جائے تو خامیاں بھی خوبیاں لگنے لگتی ہیں'' سیما نے دُکھی لہجے میں کہا۔

''ہاں ہے تو عجیب لیکن جانتی ہو یہ صرف ان کا نہیں ہم سب کا رویہ ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایک صاحب اپنے کسی جاننے والے کو محفل میں آتا دیکھ کر حیرانی سے بولے ارے آپ زندہ ہیں۔ جی ہاں الحمدللہ انہوں نے کہا آپ کو میری وفات کی خبر کس نے دی؟ کسی نے نہیں انہوں نے کہا۔ دراصل آپ کی غیر موجودگی میں لوگ آپ کی تعریف کر رہے تھے تو مجھے گمان ہوا کہ آپ وفات پا گئے ہیں۔''

کتنا غلط ہے نا یہ رویہ اس سے دلوں میں نفرتیں پیدا ہوتی ہیں اور سکون ختم ہو جاتا ہے۔ سیما نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''وہ کیسے فریحہ نے کہا۔

''دیکھو سلمیٰ خالہ اور ان کی جیٹھانی کی ان باتوں پر کتنی لڑائیاں ہوتی تھیں اور بعض اوقات تو پورے محلے میں تماشا بن جاتا تھا۔ اگر وہ یہی باتیں ان کی زندگی میں خوبی کے طور پر کہہ دیتیں تو جھگڑے نہ ہوتے سب مل کر ہنسی خوشی رہ لیتے۔''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن خیر اب کیا ہو سکتا ہے''۔ فرزین نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ ہم اس رویے کو بدلیں''۔

''ہم، وہ کیسے؟'' فرزین اور فریحہ نے حیرانگی سے کہا۔

''دیکھیں آپ فریحہ کے شور مچانے یا زیادہ بولنے پر اُسے ڈانٹ دیتی ہیں اور وہ آپ کی ڈانٹ سے خائف رہتی ہے لیکن اُس دن وہ نانی کے گھر گئی تھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ اس کے بغیر گھر اُداس لگ رہا ہے۔ میں نے یہ بات اسے بتائی تو یہ بہت خوش ہوئی اور اسی لیے کل آپ کو خوشی خوشی اپنی آئسکریم میں سے حصہ دے رہی تھی''۔

''اچھا تو یہ بات تھی میں بھی حیران تھی کہ اتنی عظیم قربانی کیسے دی جا رہی ہے'' فرزین نے کہا۔

''ایسے ہی اگر ہم ایک دوسرے کے لیے مثبت رویہ رکھیں تو کتنا اچھا ہو''۔ سیما نے کہا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' دروازے سے امی جان کی غصے بھری آواز سنائی دی۔ ''میرا خیال ہے تم اسے پڑھانے لائی تھیں''۔ انہوں نے فرزین کو گھورا۔

''وہ......'' فرزین کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فریحہ نے بھاگ کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور بولی ''امی آپ بہت ڈانتی ہیں۔ مگر ڈانٹتی رہا کریں آپ کی ڈانٹ ہمیں سست نہیں پڑنے دیتی ایک دم چست کر دیتی ہے۔''

باوجود غصے کے اس کی اس ادا سے امی جان نرم پڑ گئیں۔ پیار سے اس کے سر پر چپت لگا کر کہنے لگیں ''چلو باتیں بند اور پڑھائی شروع کرو۔''

''جی امی!'' تینوں نے مسکرا کر کتابیں کھولیں۔

فرزین نے سوچا سیما کی سوچ واقعی درست ہے ایسا رویہ اپنانے سے گھر کا ماحول بہتر ہوا۔ اگر یہ رویہ پورے معاشرے میں پھیل جائے تو سارا معاشرہ امن کا گہوارہ بن جائے۔

☆......☆......☆

جائے عبرت

''یار! آج کتنی سردی ہے مجھے بھی کوئی چادر وادر مل جائے گی؟''

موسم کے قطعاً خلاف یہ جملے زارا کی سماعت سے ٹکرائے۔ پوائنٹ کی بس میں قدم رکھتے ہوئے اس نے ترحم آمیز نظروں سے ان طالبات کو دیکھا جن کا اس میڈیکل کالج کے ساتھ ساتھ اس پوائنٹ میں بھی پہلا ہی دن تھا۔

ابھی پہلا ہی سال ہے نا! جب پڑھائی میں بیلوں کی طرح جتنا پڑے گا تو سب شوخیاں بھول جائیں گی۔ زارا نے سوچا اور انھیں نظرانداز کرتی ہوئی اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

بات یہ تھی کہ زارا نے میڈیکل کی تعلیم کے یہ چار سال باپردہ تعلیم حاصل کرتے ہوئے گزارے تھے اور مئی، جون کے شدید گرم دن بھی اس کی استقامت کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔ ساتھی طالب علم تو عادی ہو چکے تھے۔ ویسے بھی ہر گزرتا دن پڑھائی میں اس قدر مصروف کر دیتا تھا کہ پردے جیسے موضوعات پر چھیڑ چھاڑ کی فرصت بھی نہیں رہ پاتی لیکن ہر سال فرسٹ ایئر کی آمد اس موضوع کو وقتی طور پر زندہ کر دیتی۔

زارا فطرتاً ایک صاف ستھری شخصیت کی مالک تھی۔ بچپن ہی سے اس کی ہر چیز نظم وضبط کے دائرے میں ہوتی۔ کپڑے، الماری، کتابیں، بستر سب صفائی اور سلیقے کا منہ بولتا ثبوت ہوتے۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے وہ اس راز سے بھی آشنا ہو چکی تھی کہ ہماری جلد گردوغبار کے علاوہ میلی نگاہوں سے بھی آلودہ ہو جاتی ہے لہٰذا وہ شعور کے ساتھ پردے کا اہتمام کرنے لگی تھی۔ ذہانت کے ساتھ تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے اب وہ میڈیکل کے چوتھے سال میں پہنچ چکی تھی۔

سامعہ اور اس کے شوخ گروپ سے یہ اس کا پہلا سامنا تھا۔ پھر تو روز ہی بس میں اترتے چڑھتے پردے پر طنز کرتے شرارتی جملے کانوں میں پڑنے لگے۔ ایک دن پوائنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے سامعہ نے دیکھا کہ زارا بھی اسی طرف آ رہی ہے۔ حسب معمول موضوع چھیڑ دیا اپنی ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

''تمھیں پتہ ہے بعض لوگ سر کو اتنا سخت کور کیوں کرتے ہیں؟''

اس کی ساتھی نے کہا ''اصل میں جوئیں بہت ہوتی ہیں ان کے۔''

''اور چہرہ کیوں چھپاتے ہیں؟'' سامعہ نے چمک کر پوچھا۔

''شاید بہت بدشکل ہوتے ہیں۔'' جواب آیا جسے سامعہ نے رد کر دیا اور کہا۔

''ایک اہم وجہ آپ بھول رہی ہیں...... دراصل......'' پھر اسے ہنسی آ گئی اور بات پوری کرنا مشکل ہو گیا۔ ''دراصل وہ گنجی ہوتی ہیں۔''

پھر سب کا مشترکہ قہقہہ پڑا اور زارا کا نام ہی ''گنجی'' رکھ دیا گیا۔ اب وہ اسے آتا دیکھ کر گنجے پن پر بات کرنا شروع کر دیتیں۔

''بس اچھا ہے پردہ ہی رہے...... گنجی ڈاکٹر دیکھ کر مریض کے دل پر کیا گزرے گی۔''

''ارے شیمپو کا تو خرچ ہی نہیں رہا۔'' اس قسم کی باتیں چلتی رہتیں کہ زارا کا ڈیوٹیز کا شیڈول آ گیا اور اب بس میں ایک دوسرے کا سامنا ہونے کے اوقات بھی بدل گئے۔ ان مسافروں کا سامنا اب تقریباً ہر تیسرے دن ہوتا۔

ایک دن زارا ابھی ڈیوٹی پر پہنچی ہی تھی کہ باہر کچھ شور سا معلوم ہوا۔ طلبہ ہنگامہ کر رہے تھے۔ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا پوائنٹ کی ایک بس ابھی کالج کی حدود سے تھوڑا باہر نکلی ہی تھی کہ بریکر پر زوردار بریک لگنے پر ایک طالبہ اچھل کر باہر آ گری اور شدید زخمی ہوئی تھی۔ فوری طور پر اسے اسپتال لایا گیا تھا اور اس سلسلے میں طلبہ مشتعل تھے۔

زارا بھی ڈیوٹی کے بعد دیر سے گھر پہنچ پائی تھی کیونکہ آج پوائنٹ کا نظام بری طرح متاثر ہوا تھا۔ دوسرے دن اس کی چھٹی تھی اور پھر رات کی ڈیوٹی تھی جب رات وہ اسپتال پہنچی تو ساتھی ڈاکٹر طارق اور ڈاکٹر ثمینہ بھی آ چکے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ ڈیوٹی شروع کرنے سے پہلے اس زخمی طالبہ کو دیکھ لیا جائے۔ زارا ان کے ہمراہ جب وارڈ میں پہنچی تو وہاں زخمی طالبہ کے عزیز و اقارب جمع تھے۔ سب نے انھیں راستہ دیا اور وہ آئی سی یو میں داخل ہو گئے۔

وہاں ایک لڑکی مشینوں کے حصار میں تھی۔ جسم کے کئی حصے پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ مدقوق چہرہ، بے جان سا وجود، وینٹی لیٹر پر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا اس لڑکی کے قریب جب زارا پہنچی تو اس کی حالت دیکھ کر زارا کو چکر سا آ گیا۔ غور سے دیکھا تو پہچانا، وہ تو سامعہ تھی! سامعہ کی زندگی بچانے کے لیے جو دوائیں دی گئی تھیں ان کا ری ایکشن ہو گیا تھا اور اس کے سر کے بال بری طرح جھڑ گئے تھے۔ جگہ جگہ سے سر کی جلد نظر آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے تکیے پر بھی کچھ بال چپکے ہوئے پڑے تھے۔ زارا کے دماغ میں اس کی شوخ و شنگ آوازیں گونجنے لگیں۔ جس میں ایک تکرار واضح تھی، گنجی گنجی......

زارا سن ہی ہو کر دیکھتی رہ گئی۔ ڈاکٹر ثمینہ نے زارا کو سہارا دیا۔ وہ بمشکل ڈیوٹی روم تک پہنچ سکی۔ بوجھل دل سے وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گئی اور پھر گھنٹہ بھر میں ہی سامعہ کے انتقال کی خبر آ گئی۔ زارا ڈاکٹر ثمینہ سے مل کر رونے لگی۔

''تم تو میرے ساتھ ہی ہوتی تھیں ثمینہ! میں نے کبھی اسے کچھ نہ کہا تھا۔ ہمیشہ جونیئر سمجھ کر نظر انداز کیا تھا۔ کبھی بد دعا نہ دی تھی مگر شاید اللہ کو اپنے پردے کے حکم کا مذاق اڑانا پسند نہ آیا تھا۔ مالک اس پر رحم کیجیے گا......اسے معاف کر دیجیے گا۔''

ثمینہ بلک بلک کر روتی ہوئی زارا کو تسلی دینے لگی۔

☆☆☆

سچی کہانی

جویریہ شریف

بجیا

بجیا کے آنے کی خبر سن کر ایک دم سے خوش کن احساس ہوا کیونکہ 5 سال بعد بجیا لندن سے آ رہی تھیں مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کے دکھ کے احساس سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ پچھلے پانچ برسوں میں ان پر کیا کیا نہ گزر گیا اور پھر یہ سب کچھ میری نازک سی بجیا نے اکیلے تن تنہا سہا اور کس طرح سہا......! تصور سے ہی دل کانپ کانپ جاتا ہے۔

12 سال قبل ہماری پیاری سی بجیا کو امی ابو نے اپنے جاننے والے انتہائی شریف گھرانے میں بیاہ دیا۔ دنیا دیکھنا کسے کہتے ہیں تب ہی جانا کیونکہ دلہا بھائی نشے کے عادی تھے اور نشہ بھی عام سا نہ تھا۔ تحسین ہے بجیا کے لیے کہ اس کو اپنے لئے آزمائش جانا اور میاں کا خوب خیال رکھا اور محبت سے علاج پر رضامند کر لیا۔ علاج پر اُٹھنے والی تمام رقم اور دِقت میکہ کی مدد سے بجیا نے خود ہی سہی بالآخر ان کی محبت، محنت اور دعائیں رنگ لائیں اور ربِ کائنات نے ان کی سن لی۔ یوں دلہا بھائی پھر سے اپنے کاروبار کی جانب متوجہ ہوئے اور جلد ہی فیملی کے ساتھ لندن سیٹ ہو گئے۔ سب بہت خوش اور مطمئن تھے کہ آخر بجیا کو سکون مل ہی گیا دلہا بھائی کی دوستیاں بھی یہیں رہ گئیں اور وہ صحت یاب بھی ہو گئے۔

مگر کس کو معلوم تھا کہ بجیا کی آزمائش ابھی جاری تھی صرف دو سال ہی گزرے تھے کہ لندن میں دلہا بھائی بیمار ہو گئے اور ذمہ داری ایک بار پھر تین بچوں اور بیمار شوہر کی بجیا پر ہی آن پڑی۔ دیارِ غیر اور میاں بستر پر......! مگر بجیا نے ہمت نہ ہاری اور اپنے گھر کا سائبان بن گئیں لیکن کیا کیجئے کہ دلہا بھائی زندگی اور بجیا دونوں سے روٹھ گئے اور بجیا دس سالہ بیٹی، 8 سالہ بیٹے اور فقط چار سالہ بیٹی کے ساتھ تنہا رہ گئیں۔ غم کے پہاڑ، مصائب کے انبار اور میری بجیا اکیلے ہی ان سے نبرد آزما ہو گئیں کیونکہ میکہ میں بھائی اپنی فیملیز میں مصروف اور ضعیف والدین ابھی تین ذمہ داریوں میں مصروف تھے جبکہ سسرال والے تو ان کو اپنانے والے بنتے ہی نہ تھے تین سال ان حالات میں بجیا نے تنہا گزارے اور اب وہ ہم سے ملنے آ رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے ان کے آنے کا وقت آ ہی گیا خوشی اور غم مل کر آنکھوں کو بوجھل کیے ہوئے تھے۔ بچوں کو دیکھا تو وہ خوب بڑے محسوس ہوئے۔ 8 سالہ ارحم چھوٹی سی عمر میں ہی خاصا سمجھ دار لگا مگر 10 سالہ فروا خاصی کھلنڈری سی تھی اور میری بجیا وہ تو جیسے مسکرانا ہی بھول گئی تھیں امی ابو ان کو دیکھ دیکھ کر اُداس ہو رہے تھے۔

دو ہی روز بعد گھر میں کچھ تناؤ سا محسوس ہوا بجیا کو چھپ چھپ کر روتے دیکھ کر دل کڑھ کڑھ جاتا تھا بھابھی ان کو چپ کراتی دکھائی دیتی تھیں مگر امی ابو کا رویہ خاصا کھنچا کھنچا محسوس ہو رہا تھا اتنے بڑے تو ہم ہو گئے تھے کہ جان لیں کہ کچھ نہ کچھ تو ہے مگر کیا؟ یہ جاننے میں خاصا وقت لگ گیا مگر جب جانا تو دل دھک سے رہ گیا کہ کریں تو کیا کریں۔

چند ماہ قبل بجیا نے لندن میں ایک پاکستانی مسلم سے شادی کر لی تھی۔ یہ تھی وہ بات جو گھر میں تناؤ کا باعث بنی ہوئی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ بجیا وہاں حالات کا اکیلے مقابلہ کرتے بہت تھک گئی تھیں مگر وہاں سے واپس آ جاتیں تو جا نہ سکتی تھیں یہاں بچوں کو اکیلے سنبھالنا اتنا ممکن نہ تھا اور وہ سب کو پریشان بھی نہ کرنا چاہتی تھیں ایسے میں ان کی ایک ساتھی کی توسط سے ان کو رشتہ آیا۔ امی ابو سے بات کرنے کی ہمت نہ تھی اس لیے بھائی بھابھی کو حالات بتائے اور والدین کو مطلع کرنے کو کہا مگر بھائی، بھابھی، امی، ابو کو نہ بتا سکے۔ بجیا شادی کے بنا پاکستان نہ آ سکتی تھیں سو انہوں نے شادی کر لی۔ یوں ان کو اخلاقی اور مالی دونوں طرح مدد مل گئی ان کی ذمہ داری خاصی ہلکی ہو گئی تھی یوں وہ پاکستان آنے کے قابل ہوئیں۔ اب یہاں آ کر امی اور ابو کو بات معلوم ہوئی تو ابو نے صاف کہہ دیا کہ آئندہ تم یہاں مت آنا اور نہ تمہارا شوہر۔ بجیا نے اپنے حالات بتائے مگر ابو کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھے خدا خدا کر کے امی نے ابو کو اس بات پر رضامند کیا کہ بجیا اور بچے آئیں مگر ان کے شوہر یہاں نہ آئیں۔

میں حیران ہوں اور پریشان بھی آخر بجیا نے کیا غلط کیا جبکہ ان کی ذمہ داری اٹھانے والا بھی کوئی نہ تھا آخر ہمارے اتنے دین دار ابو ''بیوہ'' بیٹی کے نکاح ثانی سے کیوں خفا ہوئے حالانکہ یہ شریعت کے عین مطابق ہے اور فطری تقاضا بھی۔ کاش کہ بجیا کی آزمائش اب ختم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ ان کو سہولت واطمینان عطا کر دیں۔ (آمین)

محافظ

ہماری کام والی ماسی جس محلے میں قیام پذیر ہے وہ ایک ایسا محلّہ ہے جہاں بہت غریب لوگ قیام پذیر ہیں۔ کوئی ڈرائیور، کوئی مالی، کوئی چوکیدار، کوئی ملازم...... یہاں کے سب مکینوں کے پاس اسباب تو قلیل ہیں لیکن حق حلال کی روزی اور قناعت کی دولت کی وجہ سے ان کے دل ایمان کی حرارت سے جگمگاتے رہتے ہیں اور وہ سب مل جل کر ایک دوسرے کی خوشیاں اور غم بانٹتے رہتے ہیں۔

جہلم کے اس محلے میں ایک گھر چوکیدار کا بھی ہے۔ اس کی بیوی بہت نیک شریف اور اچھی فطرت کی مالک ہے۔ ان کی چھوٹی سی گلی میں سے دن بھر مختلف چھابڑی فروش اشیائے خورد ونوش سے لے کر عورتوں کی سجاوٹ تک کی اشیاء مثلاً چوڑیاں پراندے لیے گزرتے ہیں۔ بچے اور عورتیں ان تمام اشیاء کا مول تول کرتے نظر آتے ہیں اور دن بھر یہ رونق لگی رہتی ہے اور بچے کبھی ٹافیاں، کبھی چیونگم، کبھی کھلونے اور کبھی ریڑھی پر رکھی چھوٹی موٹی ضرورت کی اشیاء پر لپکے چلے آتے ہیں۔ انہی لوگوں میں ایک شخص قرآن شریف اور سپارے اور مختلف چھوٹی چھوٹی دینی کتب جن میں پنجسورۃ، دعائیں، نقش اور چھوٹی چھوٹی آیات کے ترجمے لیے گزرتا ہے تو اس کی صدا سب پر بھاری ہوتی ہے۔ وہ پکارتا......

''سیپارے لے لو قرآن لے لو......''

عاقبت کا سامان لے لو......''

چوکیدار کے تینوں بچے ایک مقامی سکول میں پڑھتے تھے شام کو بچوں کو چوکیدار کی بیوی خود بھی پڑھاتی۔ چونکہ وہ مڈل پاس اور بچوں کی پرورش کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسروں کے بچے ٹافی گولی یا کھلونوں پر لپکتے، یہ بچوں کیلئے گاہے بگاہے اس پھیری والے سے دینی کتب خریدتی رہتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی دینی کتب معلومات کا بیش بہا خزانہ ہوتیں۔ وہ انہیں خود بھی پڑھتی اور اس میں سے اچھی اچھی باتیں بچوں کو پڑھ کر سناتی۔

کئی روز سے وہ اپنی بچت سے اتنی رقم جمع کر رہی تھی جس سے وہ ترجمے والا قرآن پاک لے سکے اور پڑھ سکے۔ دینی علم سے اس کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس کا جی چاہتا بس وہ جلدی سے اتنے پیسے جمع کرے اور ترجمے سے قرآن کی روشنی سے آگاہی حاصل کرے۔ اس قرآن پاک کو خریدنے کے لیے وہ اپنی قلیل آمدنی میں سے بہت تنگی برداشت کرتے ہوئے رقم اکٹھا کر رہی تھی۔ وہ پھیری والا جب گلی سے گزرتا وہ سوچنے لگتی بس اگلی بار وہ قرآن پاک خرید سکے گی۔ ایک روز وہی شخص قرآن پاک سیپارے اور اپنی کتب کا بڑا سا گٹھڑ اُٹھائے اس کے دروازے پر آیا۔

چونکہ وہی اس کی سب سے بڑی گاہک تھی اور ایک عرصہ سے گلی میں آنے جانے اور گفت وشنید سے وہ اس کی شناسا تھی...... پھیری والے نے اس کے دروازے پر جا کر صدا دی۔ لیکن چونکہ اس نے کچھ نہیں لینا تھا اس لئے وہ دروازے تک نہ گئی۔ تبھی اس پھیری والے نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اسے دیکھتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

''بہن جی مجھے اچانک کسی کام کے لیے کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو چند گھنٹے کے لیے یہ قرآن پاک آپ کے گھر کے اندر بطور امانت رکھ دوں میں بس جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔''

صاف دل عورت نے قرآن پاک کے گٹھڑ کو دیکھا۔ اسے یہ پاکیزہ امانت رکھوانے میں ذرا تامل نہ ہوا، نہ ہی اُسے اس کی نیت پر شک ہوا۔

''بارش بھی بنی ہے...... اردگرد کوئی اور ایسا گھر بھی مجھے نہیں ملا...... جہاں میں رکھ دیتا...... کیا میں اندر کمرے میں رکھ دوں''۔

عورت نے جائزہ لیا۔ گٹھڑ واقعی بہت بڑا تھا وہ اور بچے اسے اُٹھا کر اندر نہیں لے جا سکتے تھے چنانچہ اس نے دروازے سے ہٹتے ہوئے خوش دلی سے اسے اندر آنے کو کہا۔ اس وقت اس کے بچے جن کی عمریں بتدریج نو سال، پانچ سال، تین سال کی تھیں، سکول سے اسی وقت لوٹے تھے اور گھر میں اُودھم مچا رہے تھے۔

وہ شخص بڑا سا گٹھڑ اُٹھاتے اندر آیا۔ باہر برآمدے میں چونکہ جگہ تنگ تھی لہٰذا وہ یہ گٹھڑ سامنے کمرے کے ایک کونے میں رکھ کر چلا گیا۔ وہ گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ کھانا کھانے کے بعد بچے کھیلنے کودنے لگ گئے۔

اس کا شوہر جہاں چوکیدار تھا وہاں سے دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں لوٹتا تھا۔ چنانچہ وہ رات کو اس کے لیے آٹا گوندھنے لگی اور پھر مشین لے کر بیٹھ گئی۔ ساتھ ساتھ بچوں کو پڑھانے لگی جو پھر بھوک بھوک کی رٹ لگانے لگے تھے۔

ابھی شام کے سات ہی بجے تھے کہ دروازہ دوبارہ کھٹکا...... سردیوں کی شام اور پھر بادلوں کی ہلکی ہلکی گھن گرج نے چہار سو اندھیرا پھیلا رکھا تھا۔ اس کے بیٹے نے دروازہ کھولا۔ سامنے پھیری والا کھڑا تھا بچے نے ماں کو آ کر بتایا ماں نے کہا ''جاؤ جا کر اسے کہو کہ آ کر گٹھڑ لے جائے''۔

وہ خود کچن میں بچوں کیلئے رات کا کھانا بنانے چل دی۔ پھیری والا اندر آیا لیکن وہ کچن میں ہونے کی وجہ سے دیکھ نہ سکی کہ وہ آتے ہوئے گھر کے دروازے کو کنڈی لگاتا ہوا آیا ہے۔ ایک لمحے میں اس پھیری والے نے بچے کو کالر سے پکڑا۔ دوسرے کو دوسرے ہاتھ سے اور بیٹی کو دھکیل کر ساتھ والے چھوٹے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی۔ بچوں کا واویلا...... شور...... عجیب سی چیخ و پکار...... وہ اس سے پہلے سنبھلتی کہ وہ ایک عفریت کی طرح اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے ایک رسی جو وہ اپنی جیب میں پہلے لے کر آیا تھا، اس نے اس کے ہاتھ پکڑ کر پیچھے ایک سیکنڈ میں باندھ دیئے اور منہ پر ٹیپ چپکا دی اور دھکیلتا ہوا کمرے میں لا کر کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔ اچانک ایسی افتاد ایسا سانحہ......

بچے اندر کمرے میں بند مدہوش ہو کر چلا رہے تھے...... اس چوڑے چکلے آدمی کی آنکھوں میں وحشت، بربریت اور شیطانیت ناچ رہی تھی۔

''پہلے ذرا سامان کی تلاشی لے لوں۔ پھر آتا ہوں......'' وہ مکروہ انداز میں اس عورت کو دیکھ کر ہنسا اور اس کی شیطانی ہنسی اس کے دل کے آر پار ہو گئی ایک مہیب بلا کی طرح کا آدمی جسے ہمیشہ اس نے پاکیزہ کتابوں کی اوٹ سے دیکھا تھا اور جو ہمیشہ نیچی نگاہ رکھ کر بات کرتا تھا...... آج ایک عفریت کے روپ میں کھڑا تھا اور اس چھوٹے سے گھر میں بہت پھرتی سے جو سامان اسے اچھا لگ رہا تھا ایک بڑی سی بستر کی چادر زمین پر بچھائے اکٹھا کرتا جا رہا تھا...... ٹی وی، ٹرانزسٹر...... گھڑیاں، کپڑے...... حتیٰ کہ اس نے چھتی پر سجے کچھ برتن بھی اتار کر گٹھڑ میں رکھ لیے اس دوران وہ خباثت سے اُسے دیکھ کر ایسے مسکرا رہا تھا جیسے شکاری شکار کو دیکھ کر ہنستا ہے...... شام کے سات بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے اور وہ بے خوف تھا باہر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی...... بچے دروازے کو پیٹ رہے تھے اور چلا رہے تھے تبھی اس نے جھٹکے سے اس کے منہ سے ٹیپ اتاری اور پوچھا...... پیٹی کے تالے کی چابی کہاں ہے......؟ بولو بولو...... جلدی بولو......

خوف زدہ اور خشک زبان سے بمشکل اس نے چابی کا پتا بتایا...... اور ساتھ ہی اُسے اللہ رسولؐ کے واسطے دینے شروع کر دیئے۔ ''بند کرو اپنی بکواس'' اس نے دوبارہ اس بے بس عورت کے منہ پر ٹیپ چپکا دی اور چابی لیے ہوئے بھاگتا ہوا چھوٹے سے سٹور میں گھس گیا...... عورت نے بے اختیار قرآن شریف کے گٹھڑ کو دیکھا جسے وہ زبان سے نہیں مگر دل سے پکار سکتی تھی...... اس نے دل سے مالک، اپنے رب عظیم کو پکارا...... اپنی ساری قوت اپنے سارے حواس کے ساتھ جس مالک و خالق کی محبت اور عظیم کتابوں کے دھوکے میں وہ لٹیرا گھر کے اندر داخل ہوا تھا قرآن شریف پر نظریں جمائے اس نے دل میں اس قرآن پاک کی عظمت و جاہ و جلال کو پکارا...... اور گلہ کیا...... کہ اے عظیم کتاب ہدایت و رُشد۔ کیا اب میری حفاظت تیرے ذمہ نہیں...... میں نے تو تیری برکتوں اور رحمتوں کے فیض کے قصے سن رکھے ہیں اور اب میری بے بسی دیکھ...... تیرے حوالے سے یہ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے......

ایک گھنٹہ...... دوسرا گھنٹہ...... تیسرا گھنٹہ...... اس لٹیرے کو ساتھ اسٹور میں گئے تیسرا گھنٹہ ہونے کو آ گیا تھا۔ بچے چیخ چیخ اور چلا چلا کر نڈھال ہو کر خاموش ہو گئے تھے۔ گاہے بگاہے ان کی سسکیوں کی آواز اُبھرتی اور پھر ڈوب جاتی۔ اس عورت نے خود کو رسیوں کی ڈوریوں سے آزاد کروانے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ اتنی سخت بندھی ہوئی تھیں کہ وہ بسیار کوشش بھی اپنی اس جدوجہد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ رات کو ساڑھے دس بجے کے قریب اس کا شوہر حسب معمول اپنی ڈیوٹی کے بعد گھر لوٹا اس نے حسب معمول گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن دروازے نے نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید بیوی بچے سردی میں لحاف میں دُبک کر سو

گئے ہیں۔ اس لئے وہ تاخیر کر رہے ہیں۔ وہ پوری قوت سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ ساتھ ساتھ اپنی بیوی کو بھی بچوں کے نام لے لے کر آوازیں دینے لگا۔

پندرہ بیس منٹ جب یہی حالت رہی تو خوف کے مارے اس سردی میں بھی اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ گلی محلے کے سارے مکین اس کے زور زور سے آوازیں دینے اور دروازہ بجانے پر جمع ہو گئے تھے۔ پریشانی کی لہر سب میں دوڑ گئی تھی۔ کسی اَن ہونی کے خوف نے سب کو اندر سے دہلا دیا تھا۔ قریبی ہمسائے کے گھر جا کر وہ چوکیدار اور اہلِ محلّہ چھت پر سے ہوتے ہوئے اپنے صحن میں اترے اور یہ دیکھ کر اُن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کمرے میں سامنے ہی کرسی پر بندھی نیم بے ہوش سی وہ عورت پڑی تھی۔ ایک شخص نے بڑھ کر ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ بچے رونے سے اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر نیم بے ہوش پڑے تھے۔ عورت کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ خوف اور دہشت سے اس کا دل ابھی تک اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ سب کو پانی پلا کر ہوش و حواس میں لایا گیا کمرے کے بیچوں بیچ بڑی سی چادر میں گھر کا قیمتی سامان، کپڑے، برتن، جوتے، گھڑیاں، ٹی وی وغیرہ پڑے تھے۔ اس عورت نے حواس میں آتے ہی ساری رُوداد سنائی اور یہ بھی کہا کہ وہ چابیاں لے کر ساتھ والے چھوٹے اسٹور میں گیا تھا اور بدمعاش ابھی تک وہیں ہے۔ سب لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی...... ڈرتے ڈرتے اس دروازے کے اندر جھانکا کہ کہیں وہ ابھی تک اندر ہی نہ چھپا بیٹھا ہو...... اور یہ نہ ہو سب پر فائر کھول دے۔

لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ پیٹی کے باہر آدھا لٹکا ہوا تھا اور اس کی گردن پر پیٹی کا بھاری ڈھکن گر اُسے واصل جہنم کر چکا تھا...... اس کی گردن پیٹی کے کنارے پر ڈھکن کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ آنکھیں چھٹی ہوئی اور چہرہ خون کے دباؤ سے سوج کر سیاہ ہو رہا تھا...... وہ خبیث وہاں تین گھنٹے سے دم گھٹنے کی وجہ سے مرا پڑا تھا۔ احساس تشکر سے چوکیدار کی بیوی رونے لگی۔ وہ کتنے بڑے عفریت کے روپ میں آیا تھا۔ اور اس لمحے اس عورت کی بے بسی اور بے چارگی کا اللہ کے سوا کون جاننے والا تھا۔ لوگوں نے اسے بدہئیت و بدشکل اور مکروہ حالت میں دیکھا اور اس کے کرتوت کو دیکھا اور اللہ کی گرفت کو جانچا اور توبہ استغفار کرنے لگے۔ تشکر کے احساس سے اس عورت کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے رب کا شکریہ کیسے ادا کرے۔

میری عزت بچانے والے تیرا شکریہ...... میرے محافظ تیرا شکریہ...... میری دعاؤں کو سننے والے تیرا شکریہ۔ تبھی ایک بزرگ کی آواز اُبھری......

بی بی اللہ پاک نے دو کام کئے ایک رحم دوسرا سزا...... رحم تیری جان و مال اور آبرو کی حفاظت فرما دی اور سزا اس شخص کے لیے جس نے خدا کا نام لے کر اس پاک کتاب کی آڑ میں گھناؤنا جرم کرنا چاہا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے اس سے پہلے بھی اس کی آڑ میں جرم کرتا رہا ہو۔ وہ عورت قرآن پاک کو چومتے ہوئے رونے لگی۔ میں نے اللہ کو اسی کتاب کا واسطہ دیا تھا اور اپنی جان اپنی آبرو کی حفاظت مانگی تھی۔ اے اللہ تو نے میرا مان رکھ لیا۔

آج اس واقعے کو بیتے سال ہو گیا ہے۔ آج بھی لوگ اگر کہیں مل کر بیٹھیں تو اس واقعے کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور لوگوں کا ایمان اللہ اور اس کتاب پر مستحکم ہو جاتا ہے۔

ترجمہ:

”یقین جانو جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلے میں سرکشی کی ہے ان کے لیے آسمانی دروازے نہ کھولے جائیں گے اور اُن کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا۔ مجرموں کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلہ ملا کرتا ہے۔ ان کے لیے جہنم کا بچھونا اور جہنم ہی کا اوڑھنا“ (الاعراف ۴۰ تا ۴۱)

(انتخاب: آسیہ کلثوم۔ صادق آباد)

☆......☆......☆

نقشِ یقین

آفس کی عمارت سے باہر نکل کر سامنے پھیلے کمپنی کے احاطے میں موجود وسیع سبزہ زار پر نگاہ پڑتے ہی خوشگواریت کا بھرپور احساس ہوتا تھا۔خصوصاً جب دل و دماغ تھک چکا ہو تو سرسبز منظر توانائی کی خوراک کا سا کام کرتا ہے۔

اس شام بادلوں کے ٹکڑے نیلے، گلابی شیڈ والے آسمان پر تیرتے کتنی ہی طرح طرح کے تجریدی آرٹ کے نمونے فلک کی لامتناہی وسعتوں پر بناتے، ڈوبتے سورج کی رخصت ہوتی کرنوں کے ساتھ مل کر نگاہ پر سحر سا کر رہے تھے۔علی الصبح سے جاگے پرندے اپنے گھروں کی جانب رواں تھے اور میں بھی آج بڑے عرصے بعد آسمان پر سیاہی پھیلنے سے قبل کام سے فارغ ہو چکا تھا۔

پارکنگ لاٹ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے مجھے لگا جیسے کوئی ہیولا سا میرے قریب لمحہ بھر کو ٹھہر گیا ہو۔اس کی آواز میری روح میں اترتی چلی گئی۔

''سعد اللہ اب تو خوش ہو نا؟''

دنیا مجھے باکمال کہتی ہے اور کچھ لاجواب بھی کہتے ہیں۔پتہ نہیں کون سا پیمانہ لوگوں کے پاس ان القابات کو کسی پر چسپاں کرنے کے لیے ہوتا ہے۔شاید مادی ترقی ہی انسانوں کے نزدیک کمال اور لاجواب کا پیمانہ ہے۔ورنہ تو مجھے اپنے والد عبدالقادر واچ میکر ہمیشہ ہی باکمال لگے اور ان کی شریک حیات میری والدہ ہمیشہ ہی لاجواب لگیں۔دونوں ہی کے پاس مادی ترقی کے انبار تو کیا آثار بھی نہ تھے۔لیکن پھر بھی میں نے جانا کہ اب کی زمین پر موجود باکمال اور لاجواب مخلوق میں سے یہ وہ دو تھے۔اگر آج میں کامیاب معاشرتی اور معاشی پہلو رکھتا تھا تو اس میں مجھے ہمیشہ دینے والے رب کی بخشش کا احساس رہتا۔اس کا شکر ادا کرنا میرے بس سے باہر تھا ورنہ میں آج تک وہ دن نہیں بھولا جب مادی وسائل میں کمی کا احساس بدن و روح کو گھلا سا دیتا لیکن میرے والد کا اطمینان بھرا چہرہ اور پرسکون انداز میں یقین سے لبریز لہجہ جیسے اس گھلتی کیفیت کو ایسے روک ڈالتا جیسے ڈیم کے دروازے سے بہتا ہوا پانی کا بہاؤ ان دروازوں کے بند ہوتے ہی پانی کے سر پٹخنے پر بھی دوسری جانب نہیں جا پاتا۔

میرے والد واقعی باکمال بنائے گئے تھے۔بس اتنا ہی کہتے ''میرے بچو! کائنات کی طاقتور ترین ہستی کہتی ہے۔'' **اِنَّ مع العسر یسرا o فَاِنَّ مع العسر یُسرا**''۔''بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ پس بے شک تنگی کے ساتھ آسانی بھی ہے''۔

وہ تین بار اتنے بھرپور یقین سے یہ آیت اور ترجمہ دہراتے کہ ہمیں لگتا ''All is Well'' چاہے Well نہ بھی ہو مگر امید کے جگنو ایسے چمک اٹھتے کہ ایسا ہی لگتا۔ہمارے دل و دماغ نے کسی بھی کمی کو محرومی کا درجہ نہ دیا۔حالانکہ انٹر سائنس اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے باوجود میں کسی بھی معیاری یونیورسٹی میں اس لئے نہیں جا سکا کیونکہ سرکاری یونیورسٹی میں میرا نام نہیں آیا اور پرائیویٹ جو کہ بہترین درسگاہیں تھیں، ان کے اخراجات پورے کرنا میرے لئے ناممکن بن گیا۔

ان دنوں میری ذہنی حالت عجیب سی تھی۔ابو بھی بہت خاموش ہو گئے تھے۔میں ان کے پانچ بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ہر ماں باپ کی طرح انہیں بھی اپنی اولاد کی خواہش خصوصاً جائز خواہش پوری کرنے کا خیال رہتا۔لیکن پھر وہی بات......ان کی ''فَاِنَّ مع العسر یسرا'' کی تسبیح نے ہمیشہ ہی ابتر حالت سے بچائے رکھا۔

لیکن اب ابو خاموش ہو گئے تو امی نے لگتا تھا ان کا مشن سنبھال لیا۔وہ ساری زندگی اپنے خاندان کی کفالت اور تربیت میں اٹھائے گئے کشٹ کیلئے اپنے میاں کی قدردان رہی تھیں۔ہم نے کبھی امی کو وسائل کی کمی کا رونا یا شکوہ کرتے نہ پایا۔ہاں میاں کے التفات میں کمی ان کو گوارا نہ ہوتی تھی۔گرمیوں کی راتوں میں وہ اگر ان کے لیے گاہے بگاہے موتیا کے گجرے نہ لاتے تو ان کا شکوہ خاصا شدید ہو جاتا اور سردیوں کی شام ہفتہ کے ایک دن انہیں ابو کی بنائی کشمیری چائے نہ ملتی تو وہ روٹھی سی ہو جاتیں۔بس یہ دو معصوم سی ان کی آپس میں ناراضگی اور منانے کی وجوہات تھیں۔گرمی ہو یا سردی امی کی کلائیاں چوڑیوں سے خالی ہوتیں تو ابو امی کی باتوں کا جواب دینا بہت مختصر کر دیتے۔ہاں! انہیں، ٹھیک ہے، بس امی کو سمجھ آجاتا کہ لاکھ گرمی ستائے میاں کے سامنے بازو میں

چوڑیاں کھنکنی چاہئیں اور ناک کی لونگ چہرے پر چمکنی چاہیے۔

باقی معاملوں میں تو مجھے لگتا کہ نجانے اللہ نے میرے ماں باپ کو بھی ویسا ہی دل دیا ہے یا نہیں جیسا میرا ہے یا ان کے اندر جذبات سے، خواہشات سے مبّرا کوئی عضو فٹ ہے کیونکہ عسر یسر کی تسبیح ان دونوں کو کافی ہو جاتی ہے زندگی کی رنگینیاں ان دونوں کے اندر کیا کچھ بھی ہلچل نہیں پیدا کرتیں؟ کیا سڑکوں پر لگے وہ لمبے چوڑے بل بورڈز جن پر اشتہا انگیز کھانے شکم سیر کو بھی شائق بنا دیں ان کو کچھ رغبت نہیں دلاتے؟ اور مصنوعات کے بل بورڈز جن پر بنے حسین و جمیل انسانی چہرے و بدن کیا دنیا کی جانب دعوت نہیں دیتے؟ اور وہ عزیز رشتے دار جو سال بہ سال حج عمرہ سے آ کر بیت الحرام کی تزئین و آرائش اور پر کیف لمحات کے سرور کا ذکر محفلوں میں اس انداز سے کرتے کہ میں ہر بار سوچتا اللہ ان پر بڑا مہربان ہے۔ تبھی ان کو اپنے مہمان کا درجہ بار بار دیتا ہے۔ کیا میرے ماں باپ کو ان کے ہر سال کے یہ مقدس دورے دل میں کسک نہیں دیتے؟ ''یہ بس صوفی منش لوگ ہیں!''

آخر اٹھارہ سال کی عمر میں، میں نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا جب یونیورسٹی ایڈمیشن کے لئے خوار ہوتا پھر رہا تھا اور مجھے پتہ چلا کہ ہمارے ایک نہایت قریبی رشتہ دار اپنے پورے خاندان سمیت حج بیت اللہ کیلئے جا رہے ہیں۔ اسی سال ان کے عمرہ کی خبر بھی ملی تھی اور اب حج کے لئے اللہ کے مہمان بننے کا شرف مل رہا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا یہ ان کا پانچواں حج تھا اور عمروں کی گنتی تو اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔ ایک میں تھا جو بنیادی ضرورت کیلئے اس لیے خوار ہو رہا تھا کہ وسائل نہ تھے۔ ایک وہ لوگ تھے جنہیں اللہ ضیوف الرحمٰن بنا رہا تھا۔ کیا فرق تھا ہمارے رتبہ میں!

مجھے اپنا آپ اور اپنے گھر والے بڑے ہی مسکین لگے...... ''بے چارے! جنہیں رب نہ اپنے گھر بلاتا ہے اور نہ ان کو زندگی میں سرور بھرے مقدس لمحات دیتا ہے جہاں وہ شانت ہو جائیں۔ نہ خوشحالی کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور نہ رتبے عطا کرتا ہے۔ یقیناً ہندوؤں کے برہمنوں کی طرح ضیوف الرحمٰن بار بار بننے والے رب کے نزدیک اعلیٰ بندے ہوتے ہیں۔ یہ میری سوچیں تھیں جن کی درستگی کی سند کوئی نہ تھی۔

اور پھر وہی ہوا کہ کسی بھی ڈھنگ کی یونیورسٹی میں میرا داخلہ نہ ہو سکا۔ سول انجینئر بننا میرا خواب تھا جو اور دوسرے بے شمار خوابوں کی طرح ٹوٹ گیا۔ بچپن سے دیکھے گئے کئی خوابوں کی طرح جنہیں عسر یسر کے فلسفہ کی گردان لیے خاموش کر دیا تھا، اسے بھی سلا دیا اب کے امی جی نے یہ کام کیا۔ جب معیاری سرکاری یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے بجائے میں داخلہ فارم اور فیس اس یونیورسٹی میں جمع کرا کر آیا جہاں لسانی تنظیمیں اکثر پڑھائی معطل کرا دیتی تھیں تو میرا دل بہت ہی بوجھل تھا۔ لیکن پڑھائی جاری رکھنے کا اس کے سوا کوئی راستہ میرے پاس نہ تھا۔ حالانکہ کتنی تعلیم اس ادارے سے ملتی یہ بھی نہیں پتہ تھا، کہ آئے دن تو ہنگامے اور ہڑتالیں ہی اس یونیورسٹی پر راج کرتی تھیں۔

''سعد اللہ واچ میکر'' کا بورڈ میری آنکھوں کے آگے پھرنے لگا۔ واچ میکر ہونا مسئلہ نہ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ واچ میکر ہونے سے میرے والد نے مادی وسائل بھرپور نہیں حاصل کیے۔

عبدالقادر کا بیٹا سعد اللہ سول انجینئر نہ بھی بن سکا تو انشاء اللہ کامیاب ہی رہے گا'' امی نے مجھے مضمحل سا لیٹا دیکھ کر میرے ہاتھ تھامے اور ماتھے پر بوسہ دیا تو جیسے ان کا یقین میری روح کی کتنی ہی کثافتیں دھو گیا۔ بالکل ایسے جیسے عُسر یسر کا فلسفہ بچپن میں کام کر جاتا تھا۔ گو وقت کے ساتھ لگا کہ آخر کب یُسر آئے گا!

اس یونیورسٹی میں جہاں میرا داخلہ ہوا تھا کمپیوٹر سائنس کا شعبہ بہتر حالات میں تھا سو میں نے بھی اس میں ہی اپنا نام لکھوایا جب کہ حالت یہ تھی کہ گھر میں کمپیوٹر تک نہ تھا۔ میں جوان ہو چکا تھا۔ دنیا بھرپور مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ اس کی حشر سامانیاں ہر جانب سے مجھے لبھاتی تھیں لیکن میری رگوں میں دوڑتا خون عسر یسر کی مالا سالوں جپتے رہنے کی بنا پر میرے نفس کے خلاف مزاحمت کرنا شروع کر دیتا اور بالآخر مجھے بھی دُہرانا ہی ہوتا ''فان مع العسر یسرا'' اور میں ہر شے سے کنارے ہو جاتا۔

اپنی پڑھائی میں آسانی کے لیے میں نے پارٹ ٹائم پُرکشش تنخواہ پر مردانے سیلون ریپشنسٹ بننے کے بجائے معمولی تنخواہ پر کسی سوفٹ ویئر ہاؤس میں معمولی سی نوکری منظور کر لی۔ میرا کام محض ڈیٹا انٹری تھا۔ لیکن اس ادارے کا اپنا ایک مقام تھا۔ مجھے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی راستہ خیر کا نکل ہی آئے گا۔

دو سال گزر گئے اور کوئی فیض بظاہر میں اس ادارے سے حاصل نہ کر سکا۔ واجبی سی تعلیم، واجبی سا تعلیمی ادارہ، واجبی سا سعد اللہ۔ میں خود ترسی کا خاصا شکار ہو چکا تھا۔

ایک صبح یونیورسٹی جانے کے بجائے میں سوفٹ ویئر ہاؤس آ گیا۔ میں سب سے پہلا انسان تھا جو اس صبح اس ادارے میں کام کے لیے

داخل ہوا تھا۔ کم از کم میرا یہ بھی خیال تھا۔ سوائے اس اسٹاف کے جس کا کام نچلی سطح کا انتظام تھا۔ میں اکیلا بیٹھا ڈیٹا انٹری میں مصروف تھا۔ تھکی ہوئی انگلیوں کو کی بورڈ سے ہٹا کر آرام دینے کے لیے میں نے میز کی سطح پر پھیلا دیا تھا۔ لوگ آنا شروع ہو چکے تھے۔ گاہے بگاہے مجھے حیرت بھرے تبصرے سننے کو مل رہے تھے۔ رضوان خان ادارے کا مالک بڑی شاندار شخصیت کا آدمی تھا۔ اس کو انسانوں کو سحر میں لانے کا فن آتا تھا۔ مرعوب ہوتا نہ تھا لیکن مرعوب کرتا تھا۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے میرے پاس سے گزرا تو خوشبو کا ایک دلفریب سا دائرہ ارد گرد بن گیا۔ جھک کر اس نے میری اسکرین پر نگاہ ڈالی، براؤن چمڑے کا فولڈر میری میز پر ٹکا کر ایک کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔ اس کو پڑھ کر مجھ سے ڈسکس کرنا''۔

کاغذ کو تھما کر وہ فولڈر لیے آگے بڑھ گیا تھا جب کہ میری نگاہ اس لہرا کر گرتے کاغذ پر جم چکی تھی جو فولڈر سے خاموشی سے پھسل گیا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب میں نے یقین کر لیا کہ میرے علاوہ کوئی اور اس کاغذ میں دلچسپی نہیں لے رہا تو میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ مقامی بینک کا چیک تھا۔ رقم چند لاکھ ہی تھی لیکن میرے جیسے کیلئے بہت سی ضرورتوں کا حل تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر میں نے چیک کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پاس کے چیمبر کی جانب بڑھ گیا۔ جس وقت میں اندر داخل ہوا ٹھیک اسی وقت ہلکی سی ٹھک کی آواز آئی اور رضوان خان نے جھک کر فوراً ہی کچھ اٹھایا۔

میں خاموش کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ قطعاً میری جانب متوجہ نہیں تھا۔ چیک ہاتھ میں تھامے میں اپنے آپ کو بدھو سا لگ رہا تھا۔ جیسے گمشدہ چیز تلاش کرنے پر کوئی انعام متمنی۔ چند منٹ بعد اس کی توجہ میری جانب ہوئی تو میں نے خاموشی سے چیک اس کی جانب بڑھا دیا۔ چیک پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے بنا کچھ کہے اس کے پرزے پرزے کر کے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔ ''شکریہ بوائے!'' جو کام تم سے کہا ہے اس کو پورا کر کے مجھ سے ڈسکس کرنا یاد رکھنا'' اتنا غیر متوقع انجام تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ انعام نہ بھی ملتا لیکن تشکر انداز تو ہوتا! آخر کو میں نے چیک اٹھا کر دیا تھا جو کسی کلائنٹ کی جانب سے تھا اور آج ہی کی تاریخ تھی۔ نہ جانے کیا معمہ ہے کیوں اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔

میں سوالوں کی بازگشت میں واپسی کے لئے پلٹا تو اچانک رضوان خان کے سوال نے میرا رُخ بدل دیا۔

''کیا تم کسی ایسے کو جانتے ہو جو ساٹھ ستر سال پرانی سوئس واچ صحیح کر سکے؟''

ہاتھ میں تھامی سنہری گھڑی کو دھیمے سے میز پر رکھتے اس نے مجھے دیکھا تو میرا سر اثبات میں ہل گیا۔

''گڈ!'' پلیز اس کو صحیح کرا دو۔ میرے بیٹے کے اسکول میں تاریخی اشیاء کی نمائش ہے۔ وہ اپنے دادا کی یہ گھڑی رکھنا چاہتا ہے مگر چلتی ہوئی حالت میں اس میں خرابی تھی مگر ابھی گرنے سے بند ہوگئی ہے۔ اتنے جملے دو سال میں رضوان خان نے میرے ساتھ ایک ساتھ شاید ہی بولے ہوں جو اس گھڑی کے معاملے میں ادا ہوئے۔

گھڑی ہاتھ بڑھا کر لیتے ہوئے مجھے پہلی بار عبدالقادر واچ میکر کی دنیا کیلئے اہمیت کا احساس ہوا۔ انسان صرف رضوان خان کے سوفٹ ویئر ہاؤس کے محتاج نہیں بلکہ میرے باپ کا ہنر بھی ان کی ضرورت ہے۔ گھڑی کے ڈائل پر بنے چھوٹے چھوٹے ہندسے خوب چمک رہے تھے۔ میں اس کو احتیاط سے سنبھال کر گھر لے آیا۔ ابو کو جب میں نے وہ ہاتھ میں دی تو نصف صدی قبل کی سوئس واچ کو دیکھ کر وہ ایسے نہال ہوئے جیسے کسی حیرت انگیز شے کو تھاما ہو۔

یہ عمدہ ترین گھڑی ہے اور نایاب بھی! ''لگتا ہے تمہارے باس کے والد خاصے باذوق انسان تھے اور احتیاط پسند بھی!'' ابو گھڑی پر نگاہ جمائے اس کی شان میں قصیدے پڑھتے پڑھتے رضوان خان کے والد کی تعریف کرنے لگے۔

''ابو جی پیسہ انسان کو باذوق بنا ہی دیتا ہے جیب میں گنجائش ہو تو ایک سے بڑھ کر ایک شے آپ حاصل کر لیتے ہیں''۔ میرے لہجے میں شاید کڑواہٹ اتر آئی تھی تبھی ابو کے شاداں و فرحاں چہرے پر یکلخت سنجیدگی چھا گئی۔

''بہت سی باتیں باآواز کہنے سے زندگی کے دیئے گئے سوالات گھٹتے یا آسان تو ہرگز نہیں ہوتے لیکن مزید مشکل اور زیادہ ضرور ہو سکتے ہیں۔ ان کو کہنے سے گریز کرنا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ اچھی امید مراد نہیں بھی لائے تو صحت تو ضرور لائے گی''۔ ان کی گہری آواز نے مجھے چپ کر دیا۔

دو دن بعد رضوان خان کو گھڑی تھماتے میں اپنے آپ کو تیس مار خان قسم کا انسان سمجھ رہا تھا جس نے وہ کام کروا دیا جو کوئی نہ کرا سکتا تھا۔ بھلا عبدالقادر واچ میکر کا بیٹا تو میں ہی تھا اور اس گھڑی کو شاید ہی میرے

ابو کے علاوہ کوئی اور درست کر سکتا۔ میرے والد گھڑیوں کے مسیحا تھے۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں یہ گھڑی اس لیے درست ہو گئی تھی کیونکہ وہ گھڑی کے بیلی تھے۔ مجھے ابو کی یہ بات سن کر ہنسی آ گئی تھی لیکن میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔

''بوائے تمہارے والد تو گھڑی شناس ہیں!'' رضوان خان کے لہجے میں تعریف اور الفاظ چنیدہ تھے۔ ایسا فلسفہ عموماً انہی کی زبان پر ہوتا ہے جو خود اوقات شناسی کے عمل سے گزر کر کسی مقام تک پہنچتے ہوں۔ اس کی گہری سیاہ بھنوؤں تلے گہری سیاہ آنکھیں میرے چہرے کو چند منٹ کھوجتی رہیں۔ نہ جانے کیا جانچ رہی تھیں۔

اگلے دن میں ناقابل بیان صدمے سے دوچار ہو گیا جب مجھے پتہ چلا کہ رضوان خان کی قلم کی جنبش نے مجھے نوکری سے نکال دیا ہے۔ ''کیوں؟'' کوئی نہ تھا جو اس سوال کا جواب دیتا۔ ''کیا بھلائی کا جواب یہ تھا میرے لیے؟'' میں شدید صدماتی کیفیت میں تھا۔ حالانکہ اس نام نہاد جاب سے اس وقت تک کسی بھی طرح کی صلاحیتی ترقی ممکن نہ ہو سکی تھی۔ سوائے اس کے کہ ایک لگی بندھی آمدنی چاہے قلیل مگر ہر ماہ مل جاتی اور ماحول بوجھل نہ تھا۔ خود میں بھی عنقریب اس کو چھوڑ ہی دیتا کہ مزید رکھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہی تھا۔ اب ایسے بنا کسی اور بندوبست کے فارغ کیے جانے سے ہتک کا احساس بھی تھا بھلائی کا غیر متوقع جواب کا صدمہ بھی اور خرچے کا مسئلہ بھی۔

میں ابو کو یا گھر میں ہرگز یہ اطلاع دے کر 'مشکل کے بعد آسانی ہے' کا درس سننا نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کون سا سسٹم فٹ ہے میرے والدین کے دماغ میں جہاں کوئی مسئلہ آئے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کون سا یسر آیا الٹا عسر ہی عسر بھاگا چلا آتا ہے''۔ میری سوچیں میرا دماغ پکار رہی تھیں اور بہتری کی کوئی صورت دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر ثمین ذکا (لندن)

آپا جان زبیدہ بلوچ کی یادیں

ایک عالمہِ دین کا مشک بو تذکرہ، جن کی صحبتِ صالحہ سے بہت سوں نے فیض حاصل کیا

اُن کی دین سے بے لوث لگاؤ کی شہرت کی خوشبو تو میرے تک پہنچ چکی تھی مگر ابھی تک ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ اگرچہ لاہور شہر میں دین کا کام کرنے والی اکثر خواتین کے اجتماع میں جانے کا موقع مل جاتا تھا مگر جب سے گاؤں، دیہاتوں میں خدمت خلق کا کام شروع ہوا تھا، شہر کی ملاقاتیں بہت کم ہوگئی تھیں۔ صرف آپا جی بنت الاسلام (پروفیسر رفعت حنیف) کے ہفتہ وار درس و تدریس کی محفل میں شرکت لازمی ہوتی تھی۔

آغاز شناسائی:

ایک روز گھر کے ضروری کام نپٹانے کے بعد اپنے ذاتی کام کیلئے باہر جانے کی تیاری میں مصروف تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی دیکھا تو گل رعنا مسعود اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھیں۔ میں ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی اور بیٹھنے کو کہا۔ وہ کہنے لگیں میرے ساتھ چلیں۔ میں نے تھوڑا شکوہ کیا کہ آپ نے اس پروگرام کیلئے فون نہیں کیا۔ وہ فوراً بولیں ''سمجھ لیں ایمرجنسی میں آنا ہوا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے تشویش سے پوچھا اور کہا ''تھوڑی دیر بیٹھیں تو سہی''

وہ بولیں ڈاکٹر ثمین میں بیٹھ نہیں سکتی ہماری معلّمہ آپا جان زبیدہ بلوچ کی کولہے کی ہڈی ٹوٹی تھی، دو ڈھائی ماہ ہو گئے ابھی تک اس جگہ کا زخم ٹھیک نہیں ہو رہا۔ سوچا تھا میں ہی پٹی کر دوں پورا سامان موجود ہے مگر کھولنے پر دیکھا ہے اس میں انفیکشن ہو چکا ہے اس لئے آپ کی ضرورت ہے!''

میں کچھ سوچ میں پڑ گئی وہ بولیں ''بی بی جی (ان کی شاگردیں بی بی جی کے نام سے مخاطب کرتی تھیں) نے کہا ہے ڈاکٹر ثمین ذکاء آپا بنت الاسلام کی شاگرد ہیں تو ضرور آجائیں گی''

ذہن ماضی کی طرف چلا گیا جبکہ چند سال پہلے مجھے آپا جی بنت الاسلام نے مشورہ دیا تھا کہ بیگم زہرہ وحید کے ساتھ گاؤں میں کام کرو۔ وہ کئی سال سے اکیلی پنجاب کے گاؤں میں تعلیم القرآن میں مصروف تھیں اگر کوئی لاعلاج مریض وہاں دیکھتیں تو اپنی جیپ میں ساتھ لے آتیں اور لاہور کے ہسپتال میں علاج کراتیں۔ اس طرح آپا جی زہرہ وحید سے میرا تعارف ہوا جو کہ نہایت فائدہ مند ثابت ہوا۔

بہر حال فوراً خیالات کو جھٹکا اور ساتھ جانے کیلئے کھڑی ہوگئی۔
گل رعنا بولیں آپ گاڑی نہ نکالیں میں واپس بھی چھوڑ جاؤں گی۔ ان دنوں آپا جان بہاولپور ہاؤس میں اپنے چھوٹے بھائی کے پاس رہائش پذیر تھیں جو کہ ہمارے علاقے سے کافی قریب تھا۔

وہاں جا کر دیکھا، اپنے کمرہ میں وہ اکیلی کروٹ کے بل لیٹی تھیں۔ درمیانی عمر کی خاتون چہرے پر نورِ ایمان کا عکس۔ میں نے جلدی سے ہاتھ دھو کر زخم کا معائنہ کیا تو وہ واقعی پیپ آلود تھا الحمدللہ ایسے زخم کی مرہم پٹی کا تمام سامان موجود تھا اس لئے میرا کام آسان ہو گیا۔ جب فارغ ہوگئی جانے کیلئے کھڑی ہوئی تو آپا جان نے کہا ''تھوڑی دیر بیٹھیں!'' میں نے کہا ''تین دن بعد یہ زخم دیکھنے آؤں گی تو تھوڑا بیٹھ سکوں گی اب اجازت دیں۔''

اگلی مرتبہ ان کے پاس گئی تو ساتھ کی چارپائی پر ان کی چھوٹی بہن بیٹھی تھیں۔ وہ لیہ سے ان کا حال پوچھنے آئی تھیں۔

اللہ کے فضل سے زخم بہت بہتر تھا مگر ابھی پٹی کی ضرورت تھی۔
کام ختم کرنے کے بعد تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھی پھر آنے کا وعدہ کیا اور رخصت لی۔

ہماری ایف جے کی ریٹائرڈ ڈاکٹرز نے ڈاکٹر نبیہہ حسن کی نگرانی میں ایک فری ہسپتال کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ خود تو تھوڑے ہی عرصہ بعد فوت ہوگئیں مگر ایک اعلیٰ قسم کا صدقہ جاریہ چھوڑ گئیں۔ اس روز وہاں ایک میٹنگ تھی سوچا گھر سے جلدی نکلتی ہوں اور آپا جی زبیدہ سے کچھ باتیں کرتی ہوں۔

تفصیلی تعارف:

وہاں پہنچی تو ان کی ہمشیرہ وہاں موجود تھیں۔ آپا نے مجھے اپنے پاس ہی پلنگ پر بٹھا لیا اور کہنے لگیں میرا زخم اب بالکل ٹھیک ہے اب اس طرف بیٹھ سکتی ہوں۔ ذرا دیر بعد ایک چھوٹی سی اسلام کے بارے میں کتاب میری طرف بڑھائی اور کہا ''ہمیں پڑھ کر سنائیں'' میں نے مسکرا

کر کہا ''آپا جان آج تو میں آپ کی باتیں سننے آئی ہوں!'' ذرا حیرانگی سے بولیں۔ ''اچھا وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ آپ کو اللہ کے دین سے ایسا گہرا لگاؤ کیسے پیدا ہوا؟''
ذرا وقفے کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی زندگی کی کہانی بتانی شروع کی۔

''ہمارا بلوچ قبیلہ پنجاب کے شہر لیہ میں قیام پذیر تھا۔ والد صاحب نہایت باعمل مسلمان تھے۔ گورنمنٹ کے محکمہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انہوں نے اپنے شہر میں پہلا لڑکیوں کا سکول قائم کیا۔ ہم دونوں بہنیں اسی سکول میں پڑھتی تھیں اور تینوں چھوٹے بھائی لڑکوں کے سکول میں زیر تعلیم تھے۔

پھر ذرا توقف کے بعد گویا ہوئیں ''میں ساتویں جماعت میں، بہن پانچویں اور بھائی چھوٹی کلاسوں میں تھے بلکہ سب سے چھوٹے بھائی نے اسی سال سکول شروع کیا تھا۔ تب ہماری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایسا المیہ تھا کہ کسی صورت صبر نہ آتا تھا۔ ہم دونوں بہنیں بہت زیادہ روتی تھیں۔ چھوٹے بھائیوں کو بھی دیکھنا ہوتا تھا۔

چند ماہ بعد والد صاحب نے شاہ ولی اللہؒ کا فارسی ترجمہ والا قرآن پاک میرے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ خود پڑھو، سمجھو اور چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی سمجھاؤ۔ بس وہ وقت تھا کہ ہم دونوں بہنیں قرآن پاک سے جڑ گئیں۔ اکٹھی بیٹھ کر پڑھتی تھیں۔ ویسے تو فارسی زبان اچھی طرح آتی تھی پھر بھی کوئی زیادہ مشکل الفاظ ہوتے تو شام کو والد صاحب سے پوچھ لیتے۔ بھائیوں کو ان کی سمجھ کے مطابق آسان انداز میں بتاتے تو وہ شوق سے سنتے''۔

یہاں میں نے قطع کلامی کی۔ ''آپا جان کیا وجہ ہے کہ آپ کی شادی نہ ہوئی؟''

وہ بتانے لگیں ''سگے چچازاد بھائی سے بچپن کی منگنی تھی۔ وہ ڈاکٹر بن رہے تھے۔ تعلیم کے دوران ہی ایسی مہلک بیماری آئی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ ہمارے رسم و رواج کچھ ایسے ہیں کہ خاندان سے باہر شادی نہیں ہو سکتی۔ میری عمر کے مطابق رشتہ نہ تھا۔ بس اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ خواتین تک دین کی تعلیم پہنچاؤں اور یہی میرا مقصدِ حیات ٹھہرا۔ میں لیہ میں خواتین اور بچیوں کو گھروں سے بلا کر تعلیم دیا کرتی تھی۔''

''جب پاکستان بنا اس وقت آپ کی کیا عمر ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہی کوئی چوبیس پچیس سال ہوگی'' انہوں نے جواب دیا۔ ''پھر چند سال بعد والد صاحب فوت ہو گئے۔ یہ بھی بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس وقت صرف چھوٹی بہن کی شادی ہوئی تھی۔ اس کا سسرال لیہ ہی میں ہے۔

بڑے بھائی لاہور سے ڈاکٹر بنے تھے وہیں ان کو بہترین نوکری مل گئی ان کی منگنی والد صاحب کی زندگی میں ہو چکی تھی چھوٹے دونوں بھائی ملتان کے کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔''

اتنی باتیں ہوئیں تو میرا جانے کا وقت ہو چکا تھا ان سے اجازت چاہی اور اگلی ملاقات کا وعدہ کیا۔

ایک خواب کا تذکرہ:

چند ہفتے بعد دوبارہ ان کی طرف جانے کا موقع ملا تو آپا جان نے حال احوال پوچھنے بتانے کے بعد کہا ''ڈاکٹر ثمین ذکاء (ہمیشہ مجھے پورے نام سے مخاطب کرتی تھیں) آج میں آپ کو اپنا خاص خواب سنانا چاہتی ہوں جس میں آپ کو بھی دلچسپی ہوگی'' میں نے شوق سے جواب دیا ''ضرور بتائیں''۔

کہنے لگیں ''اس بات کو کافی سال ہو گئے ہیں۔ میں نے خواب دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر زور الفاظ میں فرماتے ہیں 'پاکستان کے دیہاتوں کی طرف توجہ کریں'۔ چند روز بعد پھر یہی خواب دیکھا۔ میری آنکھ کھل جاتی تھی اور میں سوچوں میں گم ہو جاتی کہ یہ کام کیسے ہوگا؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے بتایا۔ ''بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ بیگم زہرہ وحید سے مشورہ کرتی ہوں کیونکہ وہ عمر میں بھی مجھ سے کافی چھوٹی ہیں، میری جوانی تو اب رخصت ہو رہی ہے۔ بس پھر میرے بلانے پر ایک روز صبح ہی وہ پہنچ گئیں۔ میں نے ساری بات ان کے سامنے رکھی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔

وہ بولیں، آپا جان! جماعت اسلامی کے پاس کوئی گاڑی نہیں جو گاؤں تک جا سکے۔ میں جانے کو تیار ہوں مگر سب سے پہلے گاڑی کا بندوبست کرنا ہوگا۔ انشاء اللہ گھر میں مشورہ کرتی ہوں، جو مجھے وراثت میں زمین ملی ہے اس کا کچھ حصہ بیچ کر اور جیپ خرید کر کام شروع کرتے ہیں۔''

اب مجھے زہرہ وحید صاحبہ کے دیہاتوں میں کام کے پس منظر

سے آگاہی ہوئی۔ بنت الاسلام صاحبہ کے مشورے پر جب زہرہ آپا سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تو انہیں گاؤں میں کام کرتے ہوئے کافی سال گزر چکے تھے۔ میں انہیں جماعت اسلامی کی نہایت اہم رکن اور مقررہ کے طور پر ہی جانتی تھی۔ زہرہ آپا کے والد جماعت اسلامی کے بنیادی رکن تھے۔ آپا نے چھوٹی عمر (تیرہ چودہ) میں آپا جان بیگم مودودی سے قرآن پاک پڑھا تھا اور اسی وقت سے اللہ غفور الرحیم کے کلام سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے منشی عالم اور منشی فاضل بھی کیا اور مولانا امین اصلاحی صاحب سے حدیث کا علم بھی حاصل کیا۔ (آپا جی زبیدہ بلوچ کی بھی بیگم مودودی سے بہت دوستی تھی۔ منصورہ میں جو بھی بڑے اجتماع ہوتے یہ رہنمائی کرنے والی نیک فطرت خواتین وہاں ضرور موجود ہوتیں)۔

جب میں نے زہرہ وحید صاحبہ کی زندگی کا خدمت خلق اور گاؤں میں دینی کام کا رخ دیکھا تو میرے دل میں ان کی عزت و وقار بہت بلند ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے اس قدر مشکل کام کی ذمہ داری نہایت احسن طریقہ سے نبھائی۔ پنجاب کے چاروں اطراف چالیس پچاس میل دور گاؤں تک جاتی رہی ہیں۔

نارنگ منڈی کئی سال پہلے ہم چند خواتین...... بیگم عامر (اللہ مغفرت کرے) آپا ساجدہ اور مسز ریحانہ رفیق بھی ساتھ گئے۔ میڈیکل کیمپ کا بندوبست تھا، بے شمار خواتین اور بچے ساتھ کے گاؤں سے بھی آئے۔ الحمدللہ ہمارے پاس دوائیوں کا بہت زیادہ سٹاک تھا۔ اس دوران آپا جی زہرہ نے ستر اسی خواتین کو پنجابی میں قرآن کی تعلیم دی۔

شام تک واپسی ہوئی تھی اگلے روز مجھے بخار ہو گیا تو معلوم ہوا کہ بیس بائیس میل تک تو ٹھیک ہے مگر پینتالیس چھیالیس میل دور کام کر کے واپس آنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں آپا جی زہرہ وحید کے جذبے اور ہمت کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی!

بہت سال پہلے جب ان کے صرف دو بچے تھے تو وہ اپنے شوہر عبدالوحید خان صاحب (اللہ مغفرت کرے) کے ساتھ، سوات کی خواتین کو دین کا پیغام دینے گئی تھیں۔ وہاں وہ لوگ ایک ماہ ناظم جماعت اسلامی کے ہاں ٹھہرے۔ وہ روزانہ ایک گاؤں میں دین کی دعوت دینے کیلئے جاتی تھیں۔ ماشاءاللہ لاقوۃ الا باللہ۔

اب اللہ کے فضل و کرم سے انہوں نے تمام دیہاتوں سے رابطہ تو رکھا ہوا ہے مگر دلوخورد میں نہایت فعال تعلیمی مرکز پچھلے چوبیس پچیس سال سے کام کر رہا ہے جس کی تمام ذمہ داری زہرہ آپا نے نبھائی ہوتی ہے۔ دور دراز گاؤں کی لڑکیوں کیلئے رہائشی درسگاہ ہے جبکہ قریب کے دیہاتوں سے بچیاں سکول میں تعلیم حاصل کرتی ہیں اور پچھلے ٹائم درسگاہ میں قرآن پڑھتی ہیں۔ آپا جی زہرہ کی بیٹیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ بڑی دونوں نسرین اور حفصہ سکول میں پرنسپل اور ہیڈمسٹریس کے فرائض انجام دیتی ہیں جبکہ حمیرا درسگاہ کی نگران ہیں۔ تینوں اپنے شوہروں کی رضامندی سے یہ کام بلا معاوضہ کرتی ہیں، البتہ فی سبیل اللہ ٹرسٹ انہیں گاڑی مہیا کرتا ہے۔ باقی عملہ ٹیچرز، آیا، ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ تنخواہ دار ہیں۔

بے شمار خاندان اس کار خیر (صدقہ جاریہ) میں اپنے مال کا کچھ حصہ ڈالتے ہیں مگر لاہور میں مقیم چنیوٹ برادری کا سب سے نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہترین اجر سے نوازے (آمین)

پھر اگلی بار بہت دنوں کے بعد آپا جان زبیدہ بلوچ کے پاس جانے کا موقع ملا۔ دن کے ساڑھے بارہ ہونے کو تھے۔ ان کی شاگردیں مس فوزیہ احمد، مسز شہلا صحاف اور ڈاکٹر اختر بٹ اپنے قرآن پاک اور رجسٹر بیگ میں ڈال رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر آپا جان نے کہا ''آج جلدی تو نہیں؟''

''بالکل بھی نہیں اِدھر سے میں نے گھر ہی جانا ہے'' میں بولی۔

''اچھا تو میں غسلخانے کا چکر لگا آؤں!''

''ٹھیک ہے میں اتنی دیر یہ کتاب پڑھتی ہوں'' میں نے قریب پڑی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

وہ تھوڑی زیادہ دیر لگا کر آئیں تو کہنے لگیں۔ ''وضو بھی ساتھ ہی کر لیتی ہوں، مجھے باوضو رہنا اچھا لگتا ہے۔''

ان کی بات میرے دل میں اتر گئی۔ جب سے میں نے بھی یہ عادت ڈال لی۔ بہت سکھ رہتا ہے۔ سچی بات ہے نیک صحبت کے دُور رس اثرات ہوتے ہیں۔

جب آپا جان پلنگ پر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئیں تو اطمینان سے پوچھا ''گاؤں کے کام کیسے چل رہے ہیں؟''

''جی اللہ کے فضل اور آپ کی دعاؤں سے نہایت عمدہ طریقے سے ہو رہے ہیں''۔ یہ سن کر ان کے چہرہ پر ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ چھا گئی۔

اب میرا تجسس مجھے مجبور کر رہا تھا کہ ان کے بارے میں مزید جانوں میں نے پوچھا آپا جان! مجھے یہ بتائیے کہ لیہ سے آپ کے منتقل ہونے کا فیصلہ کس طرح ہوا؟'' انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور بتانے لگیں۔

''میرے ڈاکٹر بھائی نے یہ سارا انتظام کیا۔ شروع میں تو میں لیہ کی مصروفیات چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ پھر انہوں نے تفصیل سے مجھے بتایا کہ اس وقت ان کے بچوں کو میری تربیت کی ضرورت ہے۔ بچوں کی والدہ گھر داری اچھی طرح کرتی تھیں مگر تعلیمی نگرانی یا تربیت کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی''۔

آپا جان نے تھوڑا وقفہ دیا اور گہری سوچ میں پڑ گئیں، پھر بات شروع کی۔ ''بہر حال اللہ کے فضل سے جلدی فیصلہ کر لیا کہ مجھے بھائی کے بچوں کو توجہ دینی ہے' انہیں اس وقت میری ضرورت ہے۔ اللہ کی مدد شامل حال رہی۔ بچوں کا ٹائم ٹیبل سکول سے آنے کے بعد رات سونے تک سیٹ کیا جس میں نماز کیلئے وقفہ شامل تھا۔ چاروں بھائی قریب کی مسجد میں دو نمازیں تو اکثر پڑھ لیتے جبکہ دونوں چھوٹی بہنیں میرے کمرہ میں میرے ساتھ پڑھتیں۔ قرآن پڑھنے کیلئے ہر بچے کا الگ وقت مقرر کیا ہوا تھا۔ باقی وقت وہ اپنا تعلیمی کام خود کرتے۔ اگر کوئی مشکل پیش آتی تو میں مدد کرتی تھی۔ اس وقت سب بچے سکول میں تھے۔ خود کام کرنے کی عادت ہو چکی تھی اس لئے بڑی کلاسوں میں انہیں میری مدد کی ضرورت نہ ہوتی تھی صرف قرآن بمعہ ترجمہ مجھ سے پڑھتے تھے۔ ان کے والد (میرے بھائی) کافی دلچسپی لیتے۔ چھٹی کے دن باری باری سب بچوں سے ہفتہ بھر کی کارکردگی کا پوچھتے۔''

اس روز یہاں تک باتیں ہوئیں۔ مجھے محسوس ہوا وہ تھک گئی ہیں۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ ملازمہ بچی کھانے کیلئے بھی پوچھ رہی تھی۔ میں نے فوراً اجازت چاہی اور گھر آ گئی۔

اس ملاقات کے تھوڑا عرصہ بعد ہم نے گھر تبدیل کر لیا۔ اب ہم لاہور کے دوسرے کونے میں آباد ہو گئے جو کہ ان کے گھر سے کافی دور تھا البتہ بیٹی عائشہ ذکاء کا میڈیکل کالج اُن کے قریب تھا۔ تھوڑا عرصہ عائشہ نے بھی آپا جان سے قرآن پاک پڑھا اور سمجھا، ان کی پاکیزہ صحبت سے فیض پایا۔

بہت سالوں سے شاہدرہ کی بستی جلال پارک/یوسف پارک میں بروز ہفتہ میڈیکل کیمپ لگتا ہے۔ ڈاکٹرز کے علاوہ مددگار خواتین بھی ساتھ جاتی ہیں، مسز ریحانہ رفیق، سلمٰی انور، گل رعنا مسعود اور فوزیہ۔ آخر الذکر دونوں خواتین نے چند سال پیشتر آپا جان سے قرآن پڑھا اور سمجھا تھا شہلا صحاف اور فرزانہ ظہیر تعلیمی شعبے کی نگرانی کیلئے بدھ یا جمعرات کو شاہدرہ جاتی ہیں۔

لاہور سے ٹرسٹ کی گاڑی سب کو گھروں سے لیتی ہے اور منزل مقصود تک پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ خرچ ہو جاتا ہے۔ راستے میں بہت سی مفید گفتگو ہوتی رہتی ہے اور جب سے ڈاکٹر نگہت زمان (ہومیو) نے قرأت سے سورۃ المزمل یاد کی ہے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ سفر کے آغاز میں وہ سنیں، بہت ہی روح پرور لطف آتا ہے۔

کبھی گل رعنا کو میرے قریب جگہ ملتی تو میں ان سے آپا جان زبیدہ بلوچ کا حال ضرور پوچھتی اور انہیں سلام بھیجتی۔ گل رعنا خود گاڑی ڈرائیو کرتی ہیں اور اکثر ان کی ملاقات کو جاتی رہتی تھیں۔ ان کا کوئی کام سنوار دیا کوئی ضرورت کی چیز لا دی۔ ویسے ان کی ضروریات نہایت مختصر تھیں۔

فوزیہ احمد ان دنوں کا ذکر بہت شوق سے کرتی تھیں جب شادمان میں ان کے گھر کے قریب بیگم محمودہ صحاف کے گھر آپا جان کا ہفتہ وار درس قرآن شروع ہوا تھا۔ گھر کا بڑا کمرہ خواتین سے بھر جاتا تھا۔ ہر ایک کا پچھلا سبق پہلے سنتیں پھر اگلا بتاتیں۔ فوزیہ کو قرآن پاک ختم کرنے کا شوق شدت سے پیدا ہوا تو آپا جان سے گھر آنے کی اجازت طلب کی۔ ایک ہمسائی کے ساتھ ان کے ہاں جاتیں اور پورا گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ تشریح کے ساتھ قرآن حکیم پڑھتیں۔

لاہور کی معتبر دیندار خواتین ان کے پرخلوص اندازِ بیان سے دین کی باتیں سنتیں اور سکون قلب حاصل کرتیں۔ انہیں آخرت کی باتیں نہایت پراثر انداز میں بتانے کی خصوصی توفیق حاصل تھی۔

کئی ایک بڑی عمر کی خواتین صرف ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے کیلئے آتیں۔ بڑی چارپائی پر اگر نوجوان لڑکیاں سبق پڑھ رہی ہوتیں تو وہ خاموشی سے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتیں۔

بیگم نعیمہ[1] جہانگیر خان، میڈم خورشید[2] نیازی اور ڈاکٹر بلقیس[3] فاطمہ ہمیشہ آپا جان سے وقت مقرر کرنے کے بعد جاتیں تاکہ اچھی طرح

1۔ تعلیم، خدمتِ خلق اور سماجی بہبود سے منسلک آنجہانی سوشل ورکر
2۔ تحریکِ پاکستان کی کارکن، گرل گائیڈ ایسوسی ایشن کی بانی
3۔ پرنسپل فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور

ان سے باتیں کرسکیں۔

ایک دلچسپ نقش:

ایک روز پرانی سہیلی کی شادی شدہ بیٹی آئی اور شکوہ یہ تھا کہ ساس بہت لڑائی کرتی ہے۔ آپا جان نے تھوڑا سوچ کر کچھ لکھا، چھوٹی سی پرچی کو نقش کی طرح بند کیا اور لڑکی سے کہا دوپٹہ کے کونے میں باندھ لو، اس وقت کھول کر پڑھنا جب لڑائی شروع ہو۔ ایک روز موقع پر جب لڑکی نے نقش کھولا تو اس میں لکھا تھا ''میں چپ رہوں گی'' اسے خود ہی ہنسی آ گئی اور ساس خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چند روز بعد آپا جان کا شکریہ ادا کرنے آئی تو تمام ماجرہ سنایا۔

ہمیشہ مثبت بات کرتی تھیں بعض اوقات پریشان حال خواتین کچھ پڑھنے کو پوچھتیں تو ہمیشہ قرآن و حدیث سے ہی بتاتیں۔ اکثر اوقات سورہ النمل پارہ ۲۰ کی آیت نمبر ۶۲ کا شروع کا حصہ پڑھنے کو بتاتیں۔

ترجمہ:۔ ''کون ہے جو بیقرار کی (دعا) قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور دور کرتا ہے برائی۔''

اگر خاتون پڑھنے کا طریقہ پوچھتی تو ان کا اکثر جواب ہوتا۔

''چاہے چند مرتبہ پڑھیں یا تسبیح کریں مگر ضروری ہے باوضو ہوں۔ دل کی طرف توجہ سے پڑھیں اور یقین رکھیں صرف اللہ ہی پریشانی کو دور کر سکتا ہے۔''

آپا جان اعلیٰ کردار اور منصفانہ سوچ کی حامل، ہمہ وقت اللہ کی خوشنودی کے لئے کوشاں رہنے والی مخلص خاتون تھیں۔

سفر آخرت:

تقریباً بارہ تیرہ سال پیشتر کی بات ہے، خبر ملی کہ آپا جان بیمار ہیں اور بھتیجی کے گھر ہیں۔ گل رعنا تو اکثر ان کی عیادت کو جاتی تھیں میں نے بھی ایک روز انہی کے ساتھ آپا جان سے ملاقات کی۔ نہایت کمزور ہو چکی تھیں۔ پاس بیٹھی تو دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے مصافحہ کیا اور پیار دیا۔ حال احوال بتانے کے بعد کہنے لگیں۔

''لیہ جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ بہن کافی بیمار ہے وہ آ نہیں سکتی اور یہی طے ہوا ہے۔ دو تین روز میں گاڑی آ جائیگی مجھے لینے''

''اچھا تو آپ چلی جائیں گی!؟'' میں نے کچھ اداسی سے کہا۔

''وہاں مجھے ملنے آؤ، زہرہ وحید کو بھی ساتھ لانا''

''ہاں جی آپا جان سب مل کر آئیں گے انشاءاللہ''

اگلے روز ساری بات آپا جی زہرہ کو بتائی تو وہ کہنے لگیں ہاں سب اکٹھے چلیں، پروگرام بناتے ہیں۔

ابھی پروگرام تو بنا ہی نہیں تھا کہ چند روز بعد صبح ہی آپا زہرہ کا فون آ گیا۔

''ثمین آپا جان فوت ہوگئی ہیں'' پھر انا للہ پورا پڑھا۔ ساتھ ہی انہوں نے بتایا کہ بہن جنازے میں شامل ہونے آئی تھیں، تھوڑی دیر بعد وہ بھی انتقال کر گئیں۔ دونوں نیک صالح روحیں ساتھ ہی ساتھ اللہ کے حضور پہنچ گئیں!

اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا کرے۔ (آمین ثم آمین)

☆☆☆

فرحت طاہر

زہے مقدر........!!

دل کی ایک دھڑکن وہیں رہ جاتی ہے۔۔۔کبھی کوئی خوشبو کا جھونکا، کبھی کوئی آواز یا تصویر وہیں پہنچا دیتی ہے، خواہ کتنا ہی وقت گزر چکا ہو!

سب سے پہلے ماہ رمضان میں رضیہ نے بتایا کہ حج پر جا رہی ہوں! حج کا موسم آ گیا!! فوراً دل میں خیال آیا۔ بالکل اس طرح جیسے کوئل کی کوک آمد بہار کی اطلاع دیتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ موسم بہار کا ہو یا حج کا، اس کی تیاری پورے سال پر محیط ہوتی ہے۔ یہ بات وہ لوگ بہت بہتر سمجھ سکتے ہیں جو اس سارے عمل کا حصہ ہوتے ہیں خواہ وہ منتظمین میں سے ہوں یا حج کرنے والوں میں سے! لیکن جو اس مقدس سفر پر چلا جائے اس کے دل کی ایک دھڑکن وہیں رہ جاتی ہے اور پھر وہاں کی ہر جنبش سے متحرک ہوتی ہے۔ کبھی کوئی خوشبو کا جھونکا، کبھی کوئی آواز یا تصویر وہیں پہنچا دیتی ہے خواہ کتنا ہی وقت گزر چکا ہو۔ اور یہ ہی وجہ ہے کہ جو یہ کر چکا ہو دوبارہ کی آرزو کرتا ہے

ہمیں حج کیے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں مگر اس کا ایک ایک لمحہ یادوں میں اسی طرح تازہ ہے کہ محو ہونا بھی چاہے تو نہیں ہو پاتا کہ ہر سال حج کا موقع اس کو نمایاں کر دیتا ہے۔ الماری کے اوپر رکھا ہینڈ بیگ جس میں حج کے دوران استعمال گئی اشیاء تبرک کے طور پر رکھی ہیں۔ دراز میں نیچے کی طرف رکھی فائل جس میں تمام حج کی متعلقہ دستاویزات رکھی ہیں۔۔۔چند سکے جو باقی بچ گئے تھے.........اور تو اور کمرے میں رکھی سیاہ چپل جو ایک سو ساٹھ روپے میں حاجی کیمپ سے خریدی گئی تھی اور جس پر حج کا پورا سفر طے ہوا کبھی بھولنے دیتی ہے؟ جوگرز اور سینڈلز جو خاص حج کے لیے خریدے گئے تھے یوں ہی دھرے کے دھرے رہ گئے اور اس چپل نے ہمارے ساتھ حج کے تمام ارکان ادا کیے۔

اس کا پس منظر عرض ہے کہ 7 ذوالحج کو جب ہم سب نہا دھو کر تیار تھے۔ چائے کا پروگرام بنا۔ چائے صبح شام بنائی اور پی جاتی ہے مگر اس وقت یہ انہونی ہوئی کہ گرما گرم چائے ہمارے پاؤں پر اس طرح گری کہ آنکھوں کے آگے تارے آ گئے۔ تکلیف اور اس سے بھی زیادہ اس بات پر آنسو کہ اس زخمی پیر کے ساتھ کیسے حج کے ارکان ادا ہو سکیں گے؟ اب تو وقت آیا تھا حج کے لئے کشید کی گئی توانائی کو استعمال کرنے کا! ایمر جنسی سی ایمر جنسی رہی! اللہ کا شکر ہے کہ سوائے اس کے کہ طواف افاضہ وہیل چئیر پر کرنا پڑا باقی تمام ارکان بخیر و عافیت اسی پاؤں اور چپل سے ادا ہوئے۔ آج پاؤں پر جلنے کوئی نشان نہیں ہے مگر بہر حال چپل کے حاجی ہونے کا اعزاز برقرار ہے۔ کمرے میں پاپوش پر رکھی اس چپل کا فخر حج کی یاد کو ماند نہیں ہونے دیتا۔ اور تو اور میڈیکل باکس میں رکھی مصری ساختہ بینڈ تیج (جو استعمال کے بعد بچ گئی تھی) کبھی کبھار ہمیں منٰی، عرفات اور مکّہ پہنچا دیتی ہے....

اس ایک خاص واقعے کے علاوہ بھی یادوں کا ایک سمندر ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا! کبھی بستر پر لیٹے لیٹے خود کو شہر مکہ کے ایک علاقے النزھۃ میں شاہراہ منصور پر واقع نو منزلہ بلڈنگ، برج ایمن کی چوتھی منزل پر واقع ایک کمرے میں موجود پاتی ہوں جہاں سات خواتین قیام پذیر ہیں! اس کمرے میں موجود واحد کھڑکی جس سے بہت دور تک کا منظر صاف اور واضح نظر آتا تھا۔ کیونکہ یہ عمارت مضافاتی علاقے میں تھی لہذا یہاں دور تک محض پہاڑیاں اور ٹیلے تھے جن میں لڑکوں کی ٹولی کبھی کبھی کھیلوں میں مصروف ہوتی تھی۔ ہم اکثر اے سی آف کر کے کھڑکی کھول کر اس خوشبو اور منظر کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتے جو ہمیں اس زمانے میں پہنچا دیتا جب محمد ﷺ یہاں موجود تھے!!

کتنی حیرت انگیز خوشی کی بات ہے کہ ہمارا یہاں قیام پورے ایک ماہ کا رہا! 26/ اکتوبر سے 27/ نومبر تک! گویا ہم یہاں مکین تھے! قصر کے بجائے پوری نمازیں ادا کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ جہاں ترپین سال رہے وہاں ہم ایک مہینے رہ کر ان کے محبوب شہر کے مکین ہونے کا فخر رکھتے ہیں! اس یقین کے ساتھ کہ ہم نے ان کی دعوت کو لبیکؔ کہا ہے۔ امید ہے کہ اللہ ہمارا انجام بخیر کرے گا ان شاء اللہ!!

کمرہ یاد آیا تو وہاں کے ساتھی مکین بھی! عمر، مزاج، ذوق کی اقسام کے باوجود ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھے ہم سب! فاطمہ نے سب سے کم عمر ہونے کے باعث کمرے کی صفائی کی ذمہ داری رضا کارانہ طور پر اپنے اوپر لی ہوئی تھی۔ قالین کو گتے کے ٹکڑوں سے صاف کرنا آسان نہ تھا مگر بقیہ خواتین اس کو سراہنے کے باوجود اس کی مدد کرنے سے قاصر تھیں بوجوہ تقاضائے عمر اور صحت! عمر پر یاد آیا جب پہلی دفعہ گروپ کے ارکان ملے تو ایک خاتون کی دوسرے کو آنٹی کہنے پر بدمزگی ہوتے ہوتے بچی (بزرگی کی قبا کوئی پہننے کو تیار ہی نہیں ہوتا!!) مگر فوراً ہی اس کا ڈراپ سین ہوگیا جب ہنس کر یہ ظاہر کیا گیا کہ جیسے لڑکیاں مذاق میں اپنی دوستوں کو آنٹی یا ہم عمر کو بیٹا کہہ کر پکارا کرتی ہیں بس ویسے ہی یہ کہنا تھا۔شکر ہے! ورنہ اس تلخی کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا کتنا تکلیف دہ ہوتا؟

ممتاز مفتی نے گھر والوں کے آپس میں تعلقات کے بارے میں ایک جگہ لکھا تھا کہ یہ یا تو الماری میں رکھے سامان کی طرح ہوتے ہیں کہ ہر چیز الگ الگ کر کے رکھی جاتی ہے یا پھر ہانڈی کی طرح ہوتے ہیں جس میں تمام مصالحہ جات آپس میں یکجان ہو کر مزہ اور ذائقہ دیتے ہیں! اور ہمارا کمرہ گویا چولہے پر دھری ہانڈی کی طرح تھا۔ چولہے کے ذکر پر اس بلڈنگ کا الیکٹرک چولہا یاد آیا جو ہر کچن میں موجود تھا اور جس پر محض کھانا گرم یا چائے بنائی جا سکتی تھی مگر ذہین پاکستانی قوم کا کیا کہنا! اس پر بڑے تجربے کیے جا رہے تھے اور پھر وہ ایک دن غائب بھی ہوگیا۔ ابھی تو یہ بہت معمولی بات لگ رہی ہے مگر اسوقت اس کے بغیر کافی مسائل ہوئے تھے۔ مسئلے پر یاد آیا ہمارے کمرے کے باہر ایک شاندار محل وقوع کا واش روم تھا مگر اس میں کنڈی نہ تھی لہٰذا کوئی اندر ہوتا تو دوسرا باہر چوکیداری کے لیے موجود ہوتا اور اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو واشنگ مشین دروازے کے ساتھ لگانی پڑ جاتی۔ ایک دفعہ دوسرے فلور والے موقع سے فائدہ اٹھا کر واشنگ مشین لے گئے کہ یہاں تو استعمال ہی نہیں ہو رہی۔ بڑی مشکل سے بازیاب کروائی کہ یہ تو ہمارے دروازے کی سیکیورٹی ہے!

اس جملہ معترضہ کے بعد یہ کہنا ہے کہ ساری خواتین کے شیر وشکر ہونے کی وجہ سے ہمارا کمرہ توجہ کا مرکز بن کر رہ گیا تھا۔ خوش ذوق، خوش باش گفتگو کی شوقین زینب خضر تو گویا انسائیکلو پیڈیا تھیں تو ہر ایک کی خیر خواہ خاتون بیگم المعروف خالہ (یہ واحد خاتون تھیں جو اس لقب پر بظاہر معترض نہ تھیں)، سگھڑ اور میٹھی زبان والی صبیحہ، کم گو اور سادہ مزاج زبیدہ، سب کی معاون اور مددگار رضیہ اور فاطمہ! ہماری خوبی لکھاری ہونے کے سوا کچھ نہ تھی کہ جس کو جان کر بقیہ سب ہم سے تعلقات اچھے رکھنے پر مجبور تھے کہ ہمارے بارے میں کچھ نہ لکھ دیں! (اپنے قلمکار ہونے کا ہم نے کسی کو نہ بتایا تھا مگر رات کو جب ڈائری میں تمام دن کی روداد لکھ رہے ہوتے تو سب ہم کو بتا رہے ہوتے کہ آپ یہ بھی لکھیں، افسوس کہ وہ ڈائری رمی کے دوران ہم سے بچھڑ گئی اور روداد حج یادداشت کی بنیاد پر لکھنی پڑی)۔

یہ ہفت رنگ کمرہ اس وقت اور چہک اٹھتا جب برابر کے کمرے سے ہمارے گروپ کی بقیہ ساتھی ثنا، فوزیہ، نادیہ اور ذکیہ آجاتیں۔ کبھی ایک ساتھ یا کبھی اکیلے اکیلے! یہاں اس کمرے کی رونق ایسی تھی کہ ہر وقت کہنے اور سننے والے موجود رہتے تھے۔ ہم سب حج کے مقدس سفر میں تھے لہٰذا ہر دلچسپی اور گفتگو کا محور اسی کے گرد رہتا تھا مگر پھر بھی انسانی جبلت کے ہاتھوں خواتین ہونے کے ناطے اور خصوصاً کھانے پکانے اور گھریلو مسائل سے بری ہونے کے باعث عام گفتگو کے لیے بھی وافر وقت ہوتا جس میں شعر و شاعری و شکاریات سے لے کر گھریلو ٹوٹکے تک شامل ہوتے۔ ہم تو جلد سونے والوں میں تھے ایک دن آنکھ کھلی تو صابن بنانے کی ترکیب بتائی جا رہی تھی۔ ہم نے چونک کر گھڑی دیکھی تو گیارہ بج رہے تھے۔ ہم کو اٹھتے دیکھ کر قصہ گو اور سامعین جلدی سے کمبل اوڑھ کر سونے لگے کہ اب بقیہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ مسکرا کر ہم نے بھی کروٹ لے لی تھی ....جب کوئی شاپنگ کر کے آتا تو ایک بازار یہیں سج جاتا۔ بھاؤ تاؤ سے لے کر پسند ناپسند تک، پھر اس سامان کے سوٹ کیس میں بند ہونے اور نکلنے کے مراحل بار بار دہرائے جاتے حتیٰ کہ سب اس کو evaluate کر لیتے!........

دیکھا آپ نے قارئین! ایک موتی اٹھاؤ تو یادوں کی پوری لڑی سامنے جگمگا اٹھتی ہے۔ اس کو یہیں چھوڑ کر موضوع پر آتے ہیں،

یعنی اس سال کا حج جس سے اس کالم کا آغاز ہوا تھا!

..........پھر تو ہر طرف سے حج پر روانگی کی خبریں آنے لگیں۔ گلی، محلہ، خاندان، حلقہ درس، آشنا نا آشنا! جوق در جوق، گروپ در گروپ!

دنیا کے ہر کونے میں ہلچل مچ اٹھی! کوئی امریکہ سے جا رہا ہے تو کوئی کینیڈا سے! برطانیہ سے جانے والوں کی بھی کمی نہیں! ایک لہر ہے جس نے پورے گلوب کو لپیٹ رکھا ہے! کچھ خواتین و مرد بیرون ملک جا رہے ہیں اپنی اولاد کی اولاد کو سنبھالنے کہ وہ اس مقدس دورے پر جا سکیں جبکہ کچھ اپنے چھوٹے بچوں کو وطن لا کر اپنے عزیزوں کے پاس رکھ کر خود اطمینان سے حج پر جا رہے ہیں !! کچھ اپنے بچوں کو حالت امتحان میں اور کچھ بیماری میں! جب سفر کا اذن مل جائے تو کوئی بھی رکاوٹ نہیں رہتی ۔ یہ ہی تو فلسفہ قربانی ہے!!

اب ہونا تو یہ تھا کہ اتنے عظیم اور عالمی اجتماع کے ہر پل کی خبر میڈیا فراہم کر کے اس سے دابستہ مقاصد کو واضح کیا جاتا ۔ جذبات کو مہمیز کیا جاتا! لبیک کی صداؤں سے فضائیں گونجنا شروع ہو جاتیں ۔ حج کی update فراہم کی جاتی! دنیا میں کہیں بھی 30 لاکھ سے زیادہ لوگ جمع ہوں اور کوئی خبر نہ ہو! مگر یہ ہمارا میڈیا تھا اور ہے جو T 20 جیسے معمولی پروگرامز میں لوگوں کو الجھائے رکھتا ہے، اس سے فرصت ملے تو انڈیا کے اور غیر ملکی مردہ اور زندہ فنکاروں کی موت اور پیدائش کے دن لے کر بیٹھ جاتا ہے ۔ کیا دنیا میں حج سے بڑا اجتماع ممکن ہے؟ یقین کریں اگر یہ ان کفار کے پاس ہوتا تو وہ خوشی سے پاگل ہوتے! کیونکہ یہ ہی موقع تھا جب دین کے مکمل ہونے کی سعادت ملی تھی ۔ اسی دن دنیا کا سب سے پہلا انسانی چارٹر عطا ہوا تھا ۔ عورتوں کے حوالے سے جامع اور بہترین حقوق ملے تھے! دنیا کا کوئی بھی مذہب یہ نہیں رکھتا! دیگر مذاہب کے پاس سوائے سالگرہیں منانے کے کچھ بھی نہیں ! قربانی کی جتنی خوبصورت مثال ہمارے پاس ہے اگر ان کو نصیب ہوتی تو وہ بے چارے انڈے رنگ رنگ کر تہوار نہ منا رہے ہوتے یا کدو چھیل چھیل کر زیمبیز نہ بنا رہے ہوتے!! کیا ہمیں اس کا احساس ہے؟ یقیناً ہے! جبھی تو جوق در جوق لوگ اس سفر پر روانہ ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے ان شاء اللہ! مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کی روح کو سمجھ نہیں پا رہے ۔

اگر میڈیا کا جائزہ لیں تو فضائیں لبیک کی آوازوں سے گونج رہی ہیں اور ہمارا میڈیا زیمبیز کی تیاری کی خبریں دے رہا ہے! کراچی اور کونے کونے میں ہونے والے فیشن شوز کی خبریں اور رپورٹ دے رہا ہے ۔ عیدالضحیٰ کے حوالے سے جانوروں کی گرانی اور بکرا منڈیوں میں ان کی کیٹ واک سے آگے نہیں بڑھ پا رہا ۔ رپورٹ بھی ہوتی ہے تو یہ کہ بچوں سے سوال کہ آپ اتنی محبت کر رہے ہیں تو کیا ان کو کاٹ کر افسوس نہیں ہوگا؟ یعنی سارا زور اس بات پر کہ کہیں قربانی، مشقت اور دین کے لیے کٹ مرنے کا جذبہ نہ بیدار ہو جائے! لوگ مہنگائی کا رونا سن کر قربانی سے رک جائیں!

یاد ش بخیر کبھی واحد چینل ہوتا تھا مگر رمضان سے ہی حج کی تیاری اور مدینہ منورہ کی تعمیر کی فلم آنا شروع ہو جاتی تھی ۔ بار بار ایک ہی فلم دیکھ کر بھی دل نہ بھرتا تھا! بلکہ شوق اور لگن پیدا ہو جاتی تھی ۔ اور آج ستر سے زیادہ چینل، ہر بچے کے پاس موبائل! جدید ترین ٹیکنالوجی مگر حج کے نام پر کوئی خبر چل جاتی ہے یا پھر کسی مولانا کو بٹھا کر تقریر! اللہ اللہ خیر صلا! نہ کوئی جدت کا استعمال نہ کسی قسم کی تخلیقی صلاحیتوں کو آزمانا!

نامعقول اور فضول رسومات کو اتنا گلیمرائزڈ کرنا اور حقیقی و روحانی واقعات کو بھولی ہوئی داستان بنا دینا! کمرشلائزیشن کے باوجود حج کا اس کی قدر سے کم اہمیت دینا! کیا دین و دنیا کے الگ ہونے کی ذہنیت کا مظاہرہ نہیں ہے؟ یہ وہی ذہنیت ہے جو رسالوں سے لے کر نصابی کتب تک میں نظر آتی ہے ۔ دینی عنصر بس گزارے لائق بنایا جاتا ہے کہ کہیں متاثر نہ ہو جائیں اپنے شاندار تشخص سے!

چار ہزار سال سے جاری ایک رسم جو تا ابد قائم رہے گی......اس کا کتنے زاویوں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے، پیش کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس چیلنج کو ہم قبول کرتے ہیں یا صرف افسوس کرتے رہیں گے؟

☆......☆......☆

آسیہ راشد

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی منجھلی صاحبزادی سے ایک ملاقات

پیکرِ مہر ومحبت، ایثار ووفا، رواداری وبردباری، فرحت وراحت، علم وعمل کو یکجا کر دیا جائے تو منجھلی آپا بنتی ہیں۔ آپ کی شخصیت ہوا کے لطیف جھونکے کی مانند ہے جو نہایت سبک خرامی سے دوسرے کے دل میں نرمی اور ٹھنڈک کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ آپ سے مل کر بے پناہ پاکیزگی کا احساس جاگزیں رہتا ہے، سراپا اللہ کی بندی دکھائی دیتی ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی چاہت وجود سے پھوٹی پڑتی ہے۔ ان سے ملنے کے بعد دل میں اللہ کی محبت فزوں تر محسوس ہوتی ہے۔ آپ ایسی عارفہ ہیں کہ ان جیسے لوگ انسانوں کے ہجوم میں خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے علم وعمل کی خوشبو اپنے اردگرد والوں کو معطر کیے رکھتی ہے۔ آپ کو اپنے والدین کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی بے پناہ خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آئیے ان سے ملاقات کرتے ہیں۔

س: آپ کا اسم شریف اور سنِ پیدائش کیا ہے؟

ج: میں اپنا نام نہیں ظاہر کرنا چاہتی آپ مجھے مولانا مودودیؒ کی صاحبزادی کہہ کر بلائیں۔ میں 1941ء میں دہلی میں پیدا ہوئی۔ دہلی میں ہمارا ننھیال تھا۔ ہماری اماں کے سات بچے دہلی میں پیدا ہوئے۔ دو لاہور کی پیدائش ہیں۔

س: ننھیال کا کوئی خاکہ کوئی یاد آپ کے ذہن میں ہو تو بتائیں؟

ج: نہیں! بالکل بھی کچھ یاد نہیں۔ میں بہت چھوٹی تھی جن دنوں ننھیال جانا ہوتا تھا۔

س: آپ پٹھانکوٹ کب آئے، وہاں کی کوئی یاد؟

ج: جب ہم لوگ پٹھانکوٹ آئے میری عمر صرف چھ برس تھی۔ وہاں کے گھر کا کوئی نقش میرے ذہن میں نہیں ہے۔ جموں کے پہاڑی سلسلے کے اختتام پر پٹھانکوٹ واقع ہے۔ چودھری نیاز علی صاحب وہاں کے مقتدر زمیندار تھے۔ وہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے پاس آئے اور اسلامی فکر وفلسفہ کی ترویج کیلئے ابا جان کا نام تجویز کیا۔ تبھی ان کے کہنے پر ابا جان نے حیدر آباد دکن سے پٹھانکوٹ کی طرف ہجرت کی۔ علامہ اقبال چاہتے تھے کہ ابا جان وہاں نمونے کی ایک بستی بنائیں جو تمام دنیا کیلئے رول ماڈل ہو، ایک آئیڈیل سی ہو۔ وہاں انہی کے کہنے پر ٹرسٹ بنایا گیا جس کا نام ابا جان نے ''دارالسلام'' رکھا۔

س: آپ لوگ لاہور کب آئے؟

ج: ہم لاہور اکتوبر 1947ء میں آئے۔ دارالسلام کی غیر منقولہ جائیداد کے بدلے میں ہمیں سوہن لال کالج کی عمارت الاٹ کر دی گئی۔ انہی دنوں ابا جان کے ساتھ حکومت وقت کا اختلاف ہو گیا وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کہا آپ تنقید بھی کرتے ہیں اور ہمارے ہی دیئے ہوئے کالج میں بھی رہتے ہیں تو ابا جان نے اسی وقت گھر والوں سے کہا سامان باندھ لیں اور یہاں سے چلیں۔ اس طرح ہم سوہن لال کالج سے اُٹھ کر مہاجرین کیلئے اسلامیہ پارک چوبرجی میں لگائے گئے خیموں میں پناہ گزین ہو گئے۔ مولوی ظفر اقبال صاحب سے ابا جان کی دوستی تھی اس لیے ہم گھر والوں کا زیادہ وقت ان کے گھر فصیح منزل اسلامیہ پارک میں گزرتا۔ ان کے گھر والوں نے ہمیں اتنی محبت دی کہ اماں اکثر کہا کرتیں کہ ان کے پاس رہ کر مجھے میکہ کبھی یاد نہیں آیا۔ مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ریاض قدیر (پرنسپل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج) ابا جان کی بہت عزت کرتے۔ ان کی والدہ کو اماں سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ بیماری میں اماں کی ٹانگوں کی مالش کیا کرتیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہم خیموں سے ان کے گھر شفٹ ہو گئے تو ہمیں لگا ہم جنت میں آ گئے ہیں۔

س: آپ کو والد یا والدہ میں سے کس سے زیادہ محبت تھی۔ آپ کی تربیت میں کس کا زیادہ کردار ہے؟

ج: ہمارے ماں باپ ہم خیال تھے اس وجہ سے ہمیں دونوں سے ایک جیسی محبت تھی۔ ہماری تربیت میں بلاشبہ اماں کا زیادہ کردار ہے کیونکہ ابا جان کے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اماں کے ساتھ ہمارے چچا ابوالخیر مودودی اور دادی اماں کی تربیت وسرپرستی نے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع دیا۔

س: آپ اپنی دادی جان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: میری دادی جان کا نام رقیہ بیگم تھا۔ وہ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے نہایت فقیرانہ مزاج پایا تھا انہیں اپنے لیے کبھی کسی خاص شے کی خواہش نہ ہوتی نہ کوئی عمدہ کپڑا نہ اعلیٰ بستر نہ اچھا کھانا حد یہ کہ باسی روٹی بھی بہت ذوق شوق سے کھالیتیں۔ ہم نے انہیں کبھی کوئی نیا کپڑا پہنے نہیں دیکھا وہ ابا جان اور چچا جان کے پرانے کپڑے ٹھیک کر کے پہن لیتیں۔ اگر کوئی انہیں نیا کپڑا دیتا تو وہ اسے کسی اور کو دے دیتیں خود نہ پہنتیں۔ ان کی شخصیت کا حیرت انگیز وصف ان کا صبر تھا۔ انہیں ابا جان سے از حد محبت تھی۔ جن دنوں ابا جان کا جیلوں میں جانا ہوتا تو وہ آزمائش کے ان مواقع پر چچا ابوالخیر کے بجائے ہمارے ہاں آکر رہتیں۔ جب ابا جان کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو ان کا چہرہ فکرمندی اور پریشانی سے مرجھائے ہوئے پھول کی مانند دکھائی دیتا تھا مگر انہوں نے لبوں سے کوئی آہ وفغاں بلند نہ کی بلکہ خاموشی سے صبر کا پیکر بنی بیٹھی رہیں۔

گھر والوں کے ساتھ خصوصاً اماں کے ساتھ بہت بہترین رویہ تھا۔ درگزر کرنا ان کا خاص وصف تھا۔ وہ میرے لڑکپن کا دور تھا جن دنوں دوپہر کو سب کو کھانا دینے کی ڈیوٹی میری تھی۔ میں نے سب کو کھانا دے دیا مگر دادی جان کو کھانا دینا بھول گئی۔ شام کو میں نے دیکھا دادی اماں نوکر کو پیسے دے کر بازار سے کچھ منگوا رہی ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کیا منگوا رہی ہیں۔ بہت اصرار کرنے کے بعد بتایا کہ بیٹا تم مجھے دوپہر کو کھانا دینا بھول گئی تھیں جب میں نے یہ سنا تو مارے شرمندگی کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں تھا۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتی۔ نجانے مجھ سے یہ بھول کیسے سرزد ہوگئی۔ میں بھاگی گئی اور کھانا لے کر آئی، اتنے میں بسکٹ بھی آ گئے۔ میں نے انہیں کھانا کھلایا اور انہوں نے مجھے بسکٹ۔ انہوں نے میری اس غفلت کو نادانی سمجھ کر درگزر کیا۔ کوئی غلط سوچ نہ آنے دی۔ کوئی عام خاتون ہوتی تو کہتی یقیناً ماں نے سکھایا ہے۔ آج بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میں نادم ہو جاتی ہوں۔

س: مولانا مودودی صاحب کی والدہ ماجدہ بلاشبہ ایک عظیم خاتون تھیں جن کے بطن سے اس دور کے مجدد نے جنم لیا۔ آپ ہمیں ان کے بارے میں مزید کچھ بتائیں؟

ج: اب میری یادداشت اتنی اچھی نہیں رہی۔ آپا حمیرہ کو بہت سی باتیں اب بھی یاد ہیں۔

س: اگر آپ اجازت دیں تو حمیرہ آپا کی کتاب ''شجر ہائے سایہ دار'' سے مولانا کی والدہ کے بارے میں چند اقتباسات قارئین کیلئے لکھ دیں؟

ج: جی ضرور مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

حمیرہ مودودی صاحبہ لکھتی ہیں......

''ہماری دادی اماں بہت حوصلے والی خاتون تھیں وہ ہماری اماں جان کو نصیحت کیا کرتی تھیں، بچوں کو ایسی عادت ڈالو کہ سرد و گرم ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ ایک وقت سونے کا نوالہ کھلاؤ، موتی کوٹ کر کھلاؤ لیکن دوسرے وقت دال سے روٹی کھلاؤ، چٹنی سے روٹی کھلاؤ، بچوں کو کبھی ایک طرح کی عادت نہ ڈالو اور نہ ہر وقت کی منہ مانگی مراد پوری کرو۔ ماں باپ تو آسانی سے اولاد کی عادتیں خراب کر دیتے ہیں، لیکن دنیا کوئی لحاظ نہیں کرتی۔ یہ تو بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیتی ہے اور پھر کہتی تھیں، میں نے اپنے بچوں کو اسی طرح پالا ہے ایک وقت اچھے سے اچھا کھلایا اور دوسرے وقت دال چٹنی سے روٹی کھلائی۔

شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے ابا جان ہر طرح کے سرد و گرم حالات سے بڑی ثابت قدمی سے گزر گئے اور ہر سختی اپنی جان پر جھیل گئے ان کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے تھے وہ اپنا ٹوٹا ہوا بٹن خود ٹانک لیتے تھے۔ اپنا پھٹا ہوا کرتہ خود رفو کر لیتے تھے۔ ان کی جیل کی کِٹ (Kit) جو پہلی گرفتاری کے بعد ہر وقت تیار رہتی تھی اس میں سوئی دھاگہ اور ہر سائز کے بٹن بھی ہوا کرتے تھے۔

ہماری دادی اماں ولی اللہ تھیں۔ وہ جب بیمار ہوتیں تو آسمان کی طرف نظریں اُٹھا کر بڑے جذبے کے ساتھ دعا اور التجا کرتے ہوئے

کہتیں من مریضم تو طبیبم ...... اور پھر وہ ٹھیک ہو جاتی تھیں۔ زندگی بھر ڈاکٹر کو نہیں دکھایا اور نہ کبھی دوا پی۔ اگر کبھی پھوڑا پھنسی نکل آتا تو اس جگہ ہاتھ رکھ کر کہتی تھیں ''اے دنبل، بزرگ مشو، خدائے ما بزرگ تر است'' (اے پھوڑے زیادہ نہ بڑھ ہمارا خدا سب سے بڑا ہے) یہ کہنے سے وہ پھوڑا ٹھیک ہو جاتا تھا۔ وہ فارسی زبان و ادب کی سکالر تھیں اور اکثر بات کا جواب فارسی اشعار میں دیا کرتی تھیں۔

دادی اماں جس محفل میں بیٹھتیں، خواہ وہ کتنی ہی بڑی محفل ہوتی ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری خاتون بول نہیں سکتی تھی۔ بس ان کی باتیں سنتے اور انہی کو دیکھتے تھے۔ وہ ہر محفل کی جان ہوتی تھیں گفتگو اس قدر ادبی اور دلچسپ کرتی تھیں کہ کوئی اگر ایک بار ان سے مل لیتا تو ان کو اور ان کی باتوں کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ غضب کی حاضر جواب تھیں ایسی برجستہ بات کہتی تھیں کہ سننے والوں کے دل پر وہ بات نقش ہو جاتی تھی۔ ایسی خوش گفتار اور بذلہ سنج خاتون تھیں کہ سب کو ہنساتیں، لیکن خود سنجیدہ رہتیں اس پر ہم لوگوں کو اور زیادہ ہنسی آتی کہ خود کیسے سوکھا سا منہ بنائے رکھتی ہیں اور ہمارا ہنسا ہنسا کر برا حال کر دیتی ہیں۔

ہمارے ماموں جو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے انہوں نے ایک روز دادی اماں سے شرط لگا دی کہ ہم دونوں شعر میں بات کریں گے، اب دادی اماں کو تو کسی کی مدد لینے کی ضرورت نہ پڑی، لیکن ہمارے ماموں بار بار ہماری اماں جان کے پاس شعر پوچھنے کیلئے آنے لگے۔

ہماری اماں جان کہتی تھیں میں نے اپنی پوری زندگی میں تمہاری دادی اماں جیسی کوئی دوسری عورت نہیں دیکھی کہ جس میں سرے نفس ہی نہ ہو انہیں کسی چیز کی طلب ہی نہیں تھی۔ دادی اماں کہا کرتی تھیں صوفیا کی یہ صفت ہے کہ وہ کسی کو منع نہیں کرتے، طمع نہیں کرتے اور جمع نہیں کرتے۔ اتفاق سے یہ تینوں صفات ہماری دادی اماں، ابا جان اور اماں جان میں موجود تھیں۔ رضا بہ قضا اور صبر جیسی اعلیٰ صفات کی ان تینوں ہستیوں نے اپنے اندر اس طرح سے پرورش کی تھی کہ وہ نفس مطمئنہ کا بہترین نمونہ بن گئے تھے۔

اماں جان کہا کرتی تھیں کہ میں نے جینے کا سلیقہ تمہاری اماں سے سیکھا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی ساس بہو دونوں ہمیشہ ایک رائے رکھتی تھیں اور کبھی آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ اماں جان نے ایک مرتبہ دادی اماں سے التجا کی: 'آپ کسی کو بددعا نہ دیں کہ آپ کی دعا اور بددعا دونوں حرف بحرف لگتی ہیں' یہ وہ موقع تھا جب ۱۹۵۳ء میں ابا جان جیل میں تھے اور دادی اماں نے کہا تھا 'جس نے میرے بیٹے کو جیل میں سڑایا ہے یا اللہ تو اسے پلنگ پر ڈال کر ایسا سڑا کہ اس کا آدھا دھڑ گل جائے' ...... اس کے چند ماہ بعد اخبارات میں خبر چھپی کہ پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو فالج ہو گیا۔

دادی اماں ہم بچوں سے کہا کرتی تھیں،

'اصل نسل سید میں کچھ بنیادی صفات ہوتی ہیں جب کوئی تم سے کہے کہ میں سید ہوں تو اسے سات چیزوں میں پرکھو' ☆ سید کو طیش نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو صرف دین کے معاملے میں آتا ہے ☆ سید کبھی ذاتی انتقام نہیں لیتا ☆ سید کبھی گالی کے جواب میں گالی نہیں دیتا ☆ سید کسی کیلئے دل میں کینہ نہیں رکھتا ☆ سید کبھی جھوٹ نہیں بولتا ☆ کسی کی غیبت نہیں کرتا ☆ سید کھانے میں عیب نہیں نکالتا، بھوک اور پیاس سے کبھی بے حال نہیں ہوتا جو سامنے آئے صبر سے کھا کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے ☆ سید پر زندگی میں کبھی نہ کبھی سخت وقت آتا ہے اور اس کی جان تک خطرے میں ہوتی ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا۔ اللہ کے بھروسے پر ہر خطرے سے لڑ جاتا ہے اور بدترین حالات سے ٹکر لے لیتا ہے۔

دادی اماں کی بیان کردہ خصوصیات درحقیقت بچوں کی تربیت اور ذہنی تشکیل کے اصول تھے تاکہ وہ اپنی نسبت کے حوالے سے ان امور کا خیال رکھیں۔ تاہم ابا جان میں یہ ساتوں خوبیاں بھرپور انداز میں موجود تھیں۔

۱۹۵۷ء میں ۶ اور ۷ دسمبر کی درمیانی رات کو دو بجے مختصر علالت کے بعد دادی اماں انتقال کر گئیں۔ تمام عمر من مریضم تو طبیبم کہہ کر تندرست ہو جانے والی دادی اماں بالآخر اپنے طبیب حقیقی سے جا ملیں ...... یعنی ہمیشہ کے لیے شفایاب ہو گئیں۔ دادی اماں کے انتقال کے بعد عام لوگوں کا خیال تھا کہ اماں جی کے صاحبزادے اتنے نامی گرامی عالم

دین ہیں کہ ضرور اپنی والدہ صاحبہ کے ایصالِ ثواب کے لیے قل، دسواں، بیسواں اور چالیسواں کریں گے اور خوب بریانی، زردے کی دیگیں پکیں گی، حلوے اور نان بانٹے جائیں گے لیکن دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اباجان نے نہ دادی اماں کے قل کیے اور نہ دوسری ہی بدعات ......اور جتنے منہ اتنی باتیں...... کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا یا اللہ تو سب کو نیک اولاد دے مگر ایسی اولاد تو کسی دشمن کو بھی نہ دے، جس نے اماں جی کو قبر میں اوندھا ڈال دیا اور پلٹ کر بھی نہ پوچھا۔ ان باتوں کا ہمارے گھر میں سب نے بہت برا مانا لیکن اباجان ان تبصروں سے بہت محظوظ ہوئے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ایک غریب آدمی جودے کا پرانا مریض تھا اور مرض کی شدت کی وجہ سے اپنی روزی خود کمانے سے قاصر تھا روزانہ ہمارے گھر دوپہر کو آتا اور اس کو بڑی عزت سے کھانا کھلایا جاتا۔ کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر ہی میں چارپائی پر لیٹ جاتا اور رات کو کھانا کھا کر اپنے گھر چلا جاتا، اباجان کا حکم تھا کہ دوپہر کو اسے کھانا دادا ابا کے ایصالِ ثواب کے لیے کھلایا جائے اور رات کو دادی اماں کے ایصالِ ثواب کا کھانا پیش کیا جائے۔ پھر اسی سال رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں سعودی عرب جانا ہوا تو اباجان نے دادی اماں کے ایصالِ ثواب کے لیے حج کیا۔ اسی طرح کئی عمرے بھی کیے۔

س: آپ نے کس سکول اور کالج سے تعلیم حاصل کی؟

ج: میں نے فیروز پور روڈ پر واقع گورنمنٹ سکول سے پڑھا اور لاہور کالج فار ویمن سے بی اے کیا۔

س: سکول اور کالج میں جب لوگ آپ کو مولانا کی بیٹی کے حوالے سے پہچانتے تو آپ کو کیسا لگتا؟

ج: سکول اور کالج کا ہر دور بہترین تھا کبھی کسی استاد کو ہم سے شکایت نہ ہوئی۔ میری عادت ہے میں زیادہ دوستیاں نہیں کرتی چند گنے چنے لوگوں سے میری علیک سلیک رہی۔ جتنے بھی لوگ مجھے جانتے تھے سبھی بہت عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے۔ اللہ کا شکر ہے بہت عزت ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب والد صاحب کی حکومتوں کے ساتھ شدید کشمکش تھی۔ ہم لیے دیے رہتے تھے تاکہ کسی کو غلط بات کرنے کا موقع نہ ملے اور وہ والد صاحب کے بارے میں طنزیہ جملہ نہ کہہ دے۔ ہمارے والد صاحب کا احترام لوگوں کے دلوں میں جبھی بڑھا جب ان کا ''رابطہ عالم اسلامی'' سے تعلق بنا۔ جب تمام دنیا کے علماء نے انھیں عزت و تکریم دی، تب ہمارے ملک کے لوگوں اور حکومتوں نے والد صاحب کی ذات اور بات کو اہمیت دینی شروع کی۔ پھر انھیں ان کے مرتبے کا اندازہ ہوا ورنہ تو بات بات پر جیل، الزامات کا سامنا رہتا تھا۔

س: اپنی شادی، شوہر اور سسرال کے بارے میں بتائیں؟

ج: میری شادی ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ شادی کی تقریب گورمانی ہاؤس میں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۵/اے ذیلدار پارک کے ساتھ ہی کچی آبادی ملحق ہے ہمارے گھر میں ہر کسی کو کھلم کھلا آنے کی اجازت تھی۔ اس سے پہلے تین شادیاں آپا اور بڑے، چھوٹے بھائی کی یہاں گھر میں ہو چکی تھیں اور تینوں میں غیر متعلقہ لوگوں کی آمد کی وجہ سے کھانا کم پڑ گیا اس لیے میری شادی گورمانی ہاؤس میں ہوئی۔

مسعود صاحب بہترین شوہر تھے۔ ان کا تعلق عمر کوٹ سندھ سے تھا۔ جہاں پنجاب ختم اور سندھ شروع ہوتا ہے۔ وہیں پر عمر کوٹ واقع ہے۔ وہ لوگ سرائیکی اور سندھی ملی جلی بولتے تھے۔

مسعود صاحب کی عمر ایک برس کی تھی جب ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور جب وہ آٹھ سال کے ہوئے تو والد بھی دنیا سے چل بسے۔ میرے شوہر کی ایک سگی بہن عائشہ ہیں ایک جیٹھ اور دیور سوتیلے ہیں۔ میرے تمام سسرال والے میرا بہت احترام کرتے ہیں خصوصاً بڑے جیٹھ نے مجھے بہت عزت دی۔ میرے سسرال والوں میں سے کبھی کوئی مجھ سے اونچی آواز میں ہم کلام نہیں ہوا۔ مجھے اپنی سسرالی زندگی کا کوئی بھی ایسا واقعہ یاد نہیں جس نے میرے دل میں کوئی رنجش پیدا کی ہو۔ عائشہ میری نند مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں اور میں ان سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے سسرال والے اباجان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کا پورا خاندان اباجان کا پرانا عاشق تھا۔ ان کے والد ترجمان القرآن منگوا کر پڑھا کرتے تھے۔ ان کی گھٹی میں یہ بات پڑی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے مجھے بہت محبت و تکریم ملی۔ مسعود صاحب کی وفات کے بعد میں نے تمام سسرال والوں سے پردہ کر لیا سوائے عائشہ کے بچوں کے کیونکہ وہ مسعود صاحب کی زندگی میں میری طرف بہت آتے جاتے تھے۔

س: اپنے میاں کی کوئی خاص بات جو آپ کو بہت یاد آتی ہو؟

ج: یوں تو مسعود بہت سی خوبیوں کے مالک تھے اگر کبھی میں بیمار پڑ جاتی تو تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ ایک بار مجھے بار بار قے ہونے لگی میں بار بار غسل خانے جانے لگی تو انھوں نے مجھے منع کر دیا، کہا آپ بستر پر لیٹی رہیں جب بھی مجھے قے آتی وہ بالٹی لے جا کر دھو کر واپس میرے پاس رکھ دیتے۔ کون شوہر اتنا خیال کرتا ہے۔ انھیں میری بے حد فکر رہتی۔ وہ سمجھتے تھے جیسے مولانا کا کردار قابل احترام ہے ان کی بیٹی کا بھی ویسے ہی ہے۔ لوگ ان کی بیٹی کی بھی ویسی ہی تکریم کریں جیسی مولانا کی کرتے ہیں۔

س: آپ لاہور میں اور وہ سندھ میں رشتہ کیسے ہوا؟

ج: (ہنستے ہوئے بولیں) کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑہ، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

س: آپ اولاد جیسی نعمت سے محروم رہیں تو آپ نے کوئی بچہ گود کیوں نہیں لیا؟

ج: میں سمجھتی ہوں جو اللہ دے دے وہ لے لو اور جو نہ دے تو اس پر صبر کرو۔ مجھے بہت سے لوگوں نے ایسا کرنے کو کہا، ڈاکٹر بلقیس فاطمہ (پرنسپل فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور) نے کہا آپ ارادہ کریں بہت خوبصورت بچہ لے کر دوں گی۔ بچہ گود لینا بہت بڑی آزمائش ہے۔ پوری زندگی اسے نبھانا پڑتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ عرصہ بعد اسے چھوڑ دیں اگر وہ برا نکلے تب بھی اسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔

س: آپ کے شوہر کی وفات کب اور کیسے ہوئی؟

ج: مسعود صاحب کو دل کا مرض لاحق تھا وہ پانچ سال بیمار رہے میں پانچ سال گھر سے باہر نہیں نکلی دل و جان سے ان کی تیمارداری کی مگر جانے والوں کو کون روک سکتا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں ان کی وفات ہوئی اس وقت ان کی عمر ترپین برس تھی۔

س: ان کی وفات کے بعد آپ نے کیسے وقت گزارا؟

ج: ان کی وفات سے پہلے میں سوچتی تھی کہ اگر انھیں کچھ ہو گیا تو میں کیسے زندہ رہوں گی۔ میرے جذبات و احساسات شدید تھے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ مجھے انسانوں کے حوالے نہ کرنا میں تیرے ساتھ رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن میں اب تک اپنے رب کے ساتھ ہوں اور یہ دن میری زندگی کے قیمتی ترین دن ہیں۔ شروع دنوں کی بات ہے ایک روز میں سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے باتیں کر رہی تھی کہ میں اپنے میاں کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی تو یہ دعا میرے لبوں سے خود بخود جاری ہو گئی۔

رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر

پھر میرے سامنے جیسے تمام راستے کھل گئے، آسان ہو گئے۔ میں نے زندگی کا مفہوم سمجھ لیا۔ اس آیت نے میرے اندر ٹھہراؤ پیدا کر دیا۔ پوری زندگی کی رہنمائی اس آیت میں موجود ہے۔ پھر میں نے کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کیا۔ میں نے اپنی زندگی کے بائیس سال مسعود صاحب کی رفاقت میں گزارے اور اب ان کی وفات کو بائیس برس ہو گئے ہیں۔ مگر میرے لیے یہ عرصہ سب سے زیادہ حسین اور خوشگوار ہے جو میں نے اپنے رب کے ساتھ گزارا۔

اللہ تعالیٰ نے میرے رہنے کے لیے بہترین انتظامات کر دیے۔ اپریل ۱۹۷۸ء میں ابا جان نے مسعود صاحب کو کہہ کر اپنے گھر سے ملحق یہ گھر دلوایا۔ اس سے پہلے ہم ماڈل ٹاؤن رہتے تھے۔ اچھرہ میں شفٹ ہونے کے بعد مجھے ماں باپ کی خدمت کا بہترین موقع ملا۔ یہ گھر قلعے کی طرح ہے۔ آج کل اس کے اوپری حصے میں میرے چھوٹے بھائی خالد فاروق اپنے اہل خانہ کے ہمراہ رہتے ہیں۔ یہ سب انتظامات میرے رب نے میرے لیے کیے۔

س: آپ کے آج کل کے معمولات کیا ہیں؟

ج: ہفتے میں پانچ دن میرے ہاں قرآن کی کلاس ہوتی ہے نماز فجر کے بعد درس کی تیاری کرتی ہوں۔ ڈیڑھ بجے دوپہر کا کھانا شام کو کوئی کتاب زیر مطالعہ رہتی ہے۔

س: آپ نے قرآن کی تعلیم کس استاد سے حاصل کی؟

ج: میں نے قرآن کا ترجمہ آپا صفیہ سلطانہ صابر قرنی سے پڑھا۔ وہ ان دنوں ہمارے سامنے والے گھر ۴/۱ے ذیلدار پارک میں رہائش پذیر تھیں۔ قرآن کی تفسیر اور حدیث کا علم میری اپنی ذاتی کوشش اور

مطالعہ ہے۔

س: آپ مولانا مودودی صاحب کی وہ خوش قسمت بیٹی ہیں جنھیں ماں باپ کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ ہمیں مولانا کے روزمرہ کے معمولات کے بارے میں بتائیں؟

ج: ابا جان عام طور پر صبح کی نماز کے بعد سوتے دس بجے اٹھ کر ناشتہ کرتے۔ ناشتے کا ایک ہی معمول تھا۔ دو تلے ہوئے انڈے، دو توس، ایک کپ چائے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ پھر وہ اپنے دفتر میں چلے جاتے۔ ظہر کی نماز کے وقت سوا ایک بجے کھانے کے لیے آتے۔ ان کے آنے سے ہم گھڑی کا ٹائم درست کرتے۔ جو اماں جان نے ان کی پلیٹ میں رکھ دیا وہی کھا لیا۔ نمک زیادہ ہے، کم ہے، کبھی شکایت نہ کی نہ کبھی نقص نکالا۔ رات عشاء کی نماز پڑھ کر کھانا کھانے آتے۔ کسی دن ان کو کام کرنا ہوتا تو رات کے کھانے میں انڈہ اور چائے لیتے۔ اگر سونا ہوتا تو سونے سے پہلے بچوں کے ساتھ وقت گزارتے۔

عصر کی نماز کے بعد چائے پیتے۔ سوال جواب کی مجلس ہوتی جو مغرب تک جاری رہتی۔ وہ ہر وقت ایک سوچ میں رہتے۔ کھاتے پیتے وقت بھی ایسا لگتا جیسے وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ کھانے کے وقت ان کی خواہش ہوتی کہ سب بچے میز پر موجود ہوں۔ اماں جان کبھی کبھار کہتیں ''میاں کبھی بچوں کو ڈانٹ بھی لیا کرو۔'' تو وہ کہتے ''تھوڑی سی دیر کے لیے آتا ہوں اس پر بھی بچوں کو ڈانٹوں۔''

س: رمضان میں کھانے کے کیا معمولات تھے؟

ج: رمضان میں سحری کے وقت اذان سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل سحری کھا لیتے۔ اس کے بعد انھیں ایک یا دو پان کھانے ہوتے۔ اور کھانے کے پورے ایک گھنٹے کے بعد وہ پانی پیتے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گردے کے مریض تھے۔

افطار کے وقت سردیوں میں چائے کی پیالی یا گرمیوں میں کٹورے میں شربت اور دو کھجوریں تناول فرماتے۔ پھر نماز کو چلے جاتے۔ واپس آ کر پوچھتے کیا بنا ہے۔ کھانے کے ساتھ دہی بڑے، پکوڑے جو بھی ہوتا کھا کر کچھ دیر آرام کرتے۔ تراویح کوئی اور پڑھاتا وتر ابا جان پڑھاتے تھے۔

س: تہجد کے بارے میں بتائیں؟

ج: اگر پڑھتے تھے تو ہمیں نہیں معلوم یا ساری رات لکھتے پڑھتے رہتے۔ وہ چار گھنٹے سے زیادہ آرام نہیں کرتے تھے اس بے آرامی کی وجہ سے جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا۔ کہتے تھے بیوی ایک ایک جوڑ مجھ سے انتقام لے رہا ہے، ایک ایک ہڈی احتجاج کر رہی ہے۔

س: عید کے معمولات کیا تھے؟

ج: صبح اٹھتے ہی بچوں کو آواز دیتے کہ اتنے بجے نماز کے لیے نکلنا ہے۔ سب کو ساتھ لے کر جاتے۔ نماز کے فوراً بعد لوگ عید ملنے آ جاتے دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔

س: مولانا کھانے میں کیا پسند فرماتے تھے؟

ج: نہاری، سری پائے، سوہن حلوہ ابا جان کی سردیوں کی فرمائش تھی اور گرمیوں کی سبزیوں میں اروی گوشت بہت پسند تھا۔ اماں جان بہت لگن اور محنت سے ان کے ذائقے اور پسند کو ملحوظ خاطر رکھ کر ان کے پسندیدہ کھانے تیار کرتیں۔

س: آپ نے مولانا کو کبھی بہت خوش دیکھا ہو؟

ج: کوئی ایسا خاص واقعہ یاد نہیں۔

س: کبھی بہت رنجیدہ دیکھا ہو؟

ج: جی ہاں، دو مرتبہ میں نے انھیں بے حد رنجیدہ دیکھا۔ پہلا موقع وہ تھا جب اخوان المسلمین کے سید قطب صاحب کو مصر کے صدر ناصر نے ۱۹۶۶ء میں شہید کر دیا تھا۔ انھیں پھانسی دے دی گئی تھی۔ ابا جان نے بتایا اس رات طبیعت میں بے پناہ اضطراب، کرب اور بے چینی رہی۔ دل بے پناہ رنجیدہ خاطر اور بے قرار رہا۔ کسی پل چین نہ آیا۔ صبح اٹھ کر معلوم ہوا کہ سید قطب کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس روز میں نے ابا جان کے دکھ کی شدت کو ان کے چہرے پہ نمایاں دیکھا۔ دوسری بار میں نے ان کو بے حد غمگین تب دیکھا جب دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ ہوا۔ ابا جان نے اس واقعے کا بہت اثر لیا اور انھیں چند روز بعد پہلا ہارٹ اٹیک ہوا۔ کیونکہ وہ پاکستان کو دولخت ہوتا دیکھ کر برداشت نہ کر سکے تھے۔

س: کیا عالم اسلامی کے انقلابی و دینی رہنما مولانا کی فکر سے متاثر

تھے؟

ج: عالم اسلام کی تمام دینی تنظیموں سے ابا جان کا رابطہ تھا۔ اخوان المسلمین کے حسن البنا اور سید قطب شہید سے بھی خطوط کے ذریعے رابطہ رہتا۔ تمام دینی فکر والے لوگ کہتے دنیا میں جہاں کہیں انقلاب آتا ہے، اس کے پیچھے مولانا مودودی کی فکر دکھائی دیتی ہے مگر آپ کے ملک میں یہ انقلاب دکھائی نہیں دیتا۔

س: کیا مولانا کی زندگی کے آخری سال میں آپ ان کے پاس تھیں۔ ان دنوں کی کچھ یادیں بتائیں؟

ج: جی ہاں۔ میں ۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء کو ابا جان کے پاس اچھرہ آ گئی تھی۔ اس طرح مجھے ان کی بہت خدمت کرنے کا موقع ملا۔ ان کے تمام کام میں ہی کرتی تھی۔ ان کا ناشتہ، کھانا، رات کی چائے تک کی ذمہ داری میری تھی۔ رات کو سونے کے لیے انھیں چادر اوڑھا کر ان کے پاس سے ہٹتی پھر اپنے گھر آ کر اپنے میاں کو کھانا دیتی۔ آخری دنوں میں ابا جان نے کھانا پینا بہت کم کر دیا تھا۔ میں ان کے لیے دو دو تین تین سالن بناتی کہ چکھتے چکھتے کچھ تو کھائیں گے۔ جوڑوں کے درد کی وجہ سے بہت سی دوائیاں لینی پڑتیں جس سے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔ ابا جان کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت پڑتی وہ مجھے ہی پکارتے۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں میں نے ان سے بہت دعائیں لیں۔ ان کی میرے لیے ایک خاص دعا تھی جو وہ روزانہ مجھے دیا کرتے ''بیٹی اللہ تیرا بھلا کرے۔'' ان کی یہ دعا میرے لیے دونوں جہانوں سے قیمتی ہے۔ وہ شکریہ کا لفظ نہ کہتے بلکہ یہ دعا دیتے۔ ان کی یہ دعا آخرت میں بھی میرے کام آئے گی ان شاءاللہ۔

س: اپنی والدہ کے بارے میں کچھ یادیں ہم سے شیئر کریں؟

ج: والدہ صاحبہ کا نام محمودہ خانم تھا وہ اچھی بیوی اور بہترین والدہ تھیں۔ اماں جان کا تعلق دہلی کے متمول مگر آزاد خیال گھرانے سے تھا۔ ان کو اپنے والدین کے گھر میں ہر طرح کی آزادی تھی۔ فیشن ایبل لباس پہننا جن میں چوڑی دار پاجامے، انگرکھے، غرارے عام تھے۔ ابا جان سے شادی کے بعد اماں جان نے اپنے آپ کو یکسر بدل لیا یہ ان کی فطری نیکی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد اماں کی والدہ نے انھیں کہا چلو چل کر فلم دیکھتے ہیں تو وہ بولیں ''نہیں اب نہیں، میاں نے منع کیا ہے۔'' لوگوں نے کہا آپ اتنے آزاد خیال گھرانے کی لڑکی بیاہ کر لے آئے ہیں تو ابا جان نے کہا اگر ایک لڑکی کو بھی نہ بدل سکا تو دنیا کو کیسے بدلوں گا۔ حق بات میں ہمیشہ وزن ہوتا ہے لازماً دوسرے پر اثر کرتی ہے۔ اسی لیے اماں ابا جان کے کہنے پر چلتی رہیں۔

ابا جان نے بھی انھیں ہر طرح کا آرام دینے کی کوشش کی۔ گھر کے کام کاج کے لیے ملازمین ہوتے، جب کبھی گھر کے حالات ٹھیک ہوتے تو خانساماں رکھ لیا جاتا کبھی کبھار اسے جواب بھی دینا پڑتا۔ ابا جان نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں نوکر نہیں رکھ کر دوں گا۔ انھیں بیوی کے آرام کی بہت فکر رہتی۔ دن کو بچے اماں سنبھالتیں اور اگر رات کو بچے نے تنگ کیا تو ابا جان سنبھالتے۔ اسی طرح اماں جان کو بھی ہم نے ابا جان کے ساتھ انتہائی تعاون کرنے والا پایا۔ انھوں نے ہر چیز سے ابا جان کو بے فکر رکھا۔ بچوں کی پڑھائی، گھر داری، شادیاں، غرض ہر طرح کے گھریلو معاملات خود نپٹائے۔ ہر طرح کے ملازمین کے ہوتے ہوئے بھی ہم سب بہنوں کو گھر داری سکھائی۔ ابا جان اماں سے کہتے میرے ہر کام میں تمھارے لیے صلہ ہوگا۔ میں اتنا کام اکیلا نہیں کر سکتا تھا۔ ابا جان کی فطرت میں تقویٰ اور درویشی جیسی صفات ان کی والدہ کی تربیت کا نتیجہ تھیں اور دن رات کام کرنے میں ان کی بیوی کا تعاون شامل تھا۔ اماں جان مجسم صبر تھیں وہ بنائی ہی ابا جان کے لیے گئی تھیں۔ ان کے لیے غم اور خوشی دونوں برابر تھے۔ دونوں میں صبر اور شکر مومن کی شان ہوتی ہے۔ زندگی کے آخری چار پانچ سال وہ باتیں بھولنے لگ گئی تھیں۔ وہ مجھے ''اماں'' کہہ کر پکارتیں۔ وہ میرے ساتھ قرآن کی کلاس میں باقاعدہ بیٹھتیں۔ میں قرآن پڑھاتے ہوئے اگر کہیں غلطی کر دیتی تو فوراً میری اصلاح کرتیں اور اگلی آیات کا ترجمہ تشریح سمجھانا شروع کر دیتیں۔

س: کیا آپ انھیں زندگی کے آخری سالوں میں اپنے گھر لے آئی تھیں؟

ج: میرے لیے اماں کے گھر رہنا مشکل تھا کیونکہ میں نے اپنے

گھر کو بھی وقت دینا ہوتا تھا۔اس لیے اماں دن کے وقت اپنے گھر رہتیں اور رات کو میرے ہاں آجاتیں۔اس طرح بار بار آنے جانے سے انھیں نمونیہ ہونے لگا تو میں نے کہا آپ مستقل میرے پاس آجائیں۔ وہ اڑھائی تین سال تک زیادہ بیمار رہیں۔ان دنوں میں نے اپنا گلبرگ والا درس چھوڑ دیا۔ میں دن رات ان کی خدمت میں مصروف رہتی۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھیں انھوں نے میرے بڑے بھائی عمر فاروق سے میرے بارے میں کہا اس نے مجھے پھولوں اور پانوں کی طرح سنبھال کے رکھا ہوا ہے۔یہی شہادتیں ہوتی ہیں یہی گواہیاں ہیں کہ اس نے دل سے خدمت کی ہے۔

س: آپ بہت نصیب والی ہیں آپ نے والدین کی خدمت کی اگر کوئی اس سعادت سے محروم رہ جائے اسے والدین کی زندگی کے بعد ان کی خدمت نہ کرنے کا احساس ہو تو وہ کیا کرے؟

ج: اسے چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ان کی مغفرت کی دعا کرے ان کے لیے صدقہ وخیرات کرے۔

س: آخری ایام میں کیا والدہ ابا جان کو یاد کرتی تھیں؟

ج: آخری سالوں میں انھوں نے ایک خواب دیکھا کہ ابا جان شیروانی پہنے آئے ہیں اور اماں سے کہہ رہے ہیں۔"بیوی تیار رہنا میں شام کو تمھیں لینے آؤں گا۔" اماں کو انتظار رہتا کہ ابا جان کسی بھی جمعے کی شام کو آئیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔اماں جان بروز جمعہ آٹھ بج کر بیس منٹ پر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں۔

س: کوئی ایسا دن جب آپ نے اماں کو بہت خوش دیکھا ہو؟

ج: جب ابا جان کی پھانسی کی سزا ختم ہوئی اور وہ گھر آگئے۔دکھ وہ کبھی ظاہر نہ ہونے دیتی تھیں۔نہ کبھی ایسا جملہ بولا جس سے غم آشکار ہو۔

س: کیا وہ کبھی مولانا سے بچوں کو وقت نہ دینے پر ناراض ہوئیں؟

ج: جی!وہ ابا جان سے کہتیں تم نے بچوں کو وقت نہیں دیا اللہ شاید تمھیں قیامت کے دن پوچھے گا اس کے بارے میں کہ تم نے دنیا کو ٹھیک کرنے کی فکر کی بچوں کی فکر نہ کی۔

س: اماں جان کی سب سے قریبی دوست کون سی تھیں؟

ج: بنت الاسلام صاحبہ اماں کو بہت محبوب تھیں وہ اماں اور ابا جان دونوں سے عقیدت رکھتی تھیں۔اماں جان سے ابا جان کے بارے میں ایک ایک چیز بہت تفصیل سے پوچھتیں۔ان کے علاوہ آپا خورشید سے اماں کے ذاتی نوعیت کے تعلقات تھے وہ اماں کے سب کام کرواتیں۔

س: ۱۹۸۲ء میں آپ کے ہاں سے خواتین کی ادبی تنظیم کا آغاز ہوا جس کا نام بعد میں "حریم ادب" رکھا گیا۔کیا آپ سمجھتی ہیں حریم ادب کے باقاعدہ پروگراموں نے ادبی نکھار کے علاوہ لوگوں کی اصلاح کا بھی کام کیا؟

ج: میرے ہاں حریم ادب آپا نسیم آراء (بنت الاسلام) نے شروع کروائی۔ یہ ان کی خواہش تھی۔ میں نے اس خواہش کا احترام کیا۔ مجھے اس پروگرام کی بہت خوشی تھی۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس سے لکھنے والوں کو راہنمائی کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی بھی ملتی ہے اور نئے ادیب اور شاعر جنم لیتے ہیں۔صرف لکھنے والے ہی نہیں پڑھنے اور سننے والے بھی اس پروگرام میں شامل ہو کر مستفید ہوتے ہیں۔حریم ادب میں میں نے بڑے بڑے لوگوں کی میز بانی کی ان کی میرے گھر آمد میرے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔مثلاً آپا نسیم آرا، مسز زینب کا کاخیل، ننھی آپا (سعیدہ احسن) منی آپا (عفت قریشی) اور بہت سے دوسرے لوگ شامل ہیں۔ آپا نسیم آرا سے میں نے زندگی کا ہمیشہ مثبت پہلو دیکھنا سیکھا۔ یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی۔

س: آپ نے اپنے گھر سے ملحق مسجد بنوائی اس کی تعمیر کا خیال کیسے آیا؟

ج: جب ہم لوگ اچھرہ آئے تو یہاں گھر کے قریب ہی ایک مکان بک رہا تھا جو میرے میاں نے خرید لیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ابا جان کا انتقال ہو گیا اور ہم ان کی گھر میں تدفین کرنے پر مجبور ہو گئے۔ میرے میاں نے سوچا اگر ان کی تدفین یہاں ہو رہی ہے تو ہم مستقبل میں اس گھر کو وقف کر دیں گے اور یہاں مسجد بنائیں گے۔شوہر کا ارادہ تھا مگر وسائل نہ تھے۔ پھر ان کی وفات ہو گئی اور یہ ذمہ داری مجھ پر آ گئی۔ میں بیس سال تک دعا کرتی رہی کہ اے اللہ مجھے وسائل بھی دے اور بنا کے دینے والے بھی دے۔ پھر اللہ نے راستے کھول دیے۔ مسعود کی پراپرٹی ماڈل ٹاؤن میں بکی تو میں نے سب سے پہلے مسجد بنوانی شروع کی۔ مسجد

بنانے کے لیے لوگ بھی ایسے با کمال ملے کہ قابل تعریف ہیں۔ میں نے انھیں کہا مجھے خواب میں اشارہ ملا ہے کہ مسجد سترہ لاکھ میں بنانی ہے۔ انھوں نے مکان توڑا آدھی اینٹیں استعمال کر کے دو ماہ کے اندر اندر مسجد تیار کر دی اور سترہ لاکھ سے کچھ اوپر خرچ ہوئے۔

رمضان آنے والا تھا میں دعائیں کر رہی تھی کہ یکم رمضان ہو اور جمعہ کا دن ہو جب مسجد کا افتتاح ہو، اللہ نے میری دعا قبول کر لی اور میری خواہش کے عین مطابق میاں طفیل محمد صاحب نے رمضان کی پہلی تراویح سے مسجد کا افتتاح کیا اور وہ جمعہ کا مبارک دن تھا۔ دس مرلے میں بننے والی مسجد میں اتنی وسعت ہے کہ بنانے والے اور دیکھنے والے دونوں ہی حیران ہیں کہ یہ جگہ دس مرلے لگتی نہیں بہت وسیع لگتی ہے۔

دس سال تک اس کا انتظام میں نے خود کیا آج کل اس کا انتظام جماعت اسلامی کے سپرد ہے۔ ابا جان کے گھر کو لائبریری کی شکل دے دی گئی ہے یہاں آنے والے مسجد میں پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ تراویح اور عیدین بھی پڑھائی جاتی ہیں۔

س: کیا اس گھر کے علاوہ بھی مولانا کی کوئی پراپرٹی ہے؟

ج: جی نہیں صرف یہ گھر ہے جسے اب لائبریری بنا دیا گیا ہے۔

س: آپ کی کوئی خواہش جو ابھی تک پوری نہ ہوئی ہو؟

ج: میں اللہ تعالیٰ کی بے حساب شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے بہترین خاندان میں پیدا کیا، بہترین پرورش دلوائی، بہترین ازدواجی زندگی دی۔ جتنا بھی وقت گزرا کہیں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اب صرف ایک ہی تمنا ہے کہ اللہ اس کہانی کا آخر بھی اچھا کر دے۔

س: آپ کا ''بتول'' سے تعارف کب ہوا؟ آپ کے خیال میں کیسا پرچہ ہے؟

ج: جب سے ہوش سنبھالا بتول کو اپنے گھر میں پایا۔ بتول ایک معیاری پرچہ ہے۔

س: نوجوان نسل کے لیے کوئی پیغام آپ دینا چاہیں؟

ج: نوجوان نسل کے لیے ایک ہی پیغام دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کو آخرت کے مقصد سے دور نہ ہونے دیں۔ زندگی کا مقصد آخرت ہے، علم حاصل کریں۔ اس کے مطابق اپنا لائحہ عمل طے کریں تاکہ ایک بامقصد زندگی گزرے۔ نوجوان نسل اتنی ذہین ہے کہ اسے خود دیکھنا ہے کہ مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے جس کے لیے خلافت راشدہ کے سنہری دور کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ پھر جس قدر ان کی راہ اپنا سکتے ہیں اپنائیں۔ ان کے دور کی صحابیاتؓ کو بھی رول ماڈل بنائیں۔

س: کوئی پسندیدہ شعر؟

ج: ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

آپ کا بے حد شکریہ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہمیں ملاقات کا شرف بخشا۔ ۞

میری لائبریری سے

کتاب کا نام: پوشیدہ تیری خاک میں
مصنف: رفیع الدین ہاشمی
پبلشر، ادبیات، اردو بازار لاہور
رابطہ نمبر: 04237232788
السلام علیکم پیارے قارئین:۔

آج کی کتاب ہے تو سفر نامہ لیکن ادبی ذوق اور شاعرانہ مزاج رکھنے والوں کے لیے ''ملٹی وٹامن'' ہے۔ سفر نامہ......اور وہ بھی سرزمین اندلس کا......اور لکھا ہو رفیع الدین ہاشمی صاحب نے ......کیا کسی بھی ''بہترین کتاب'' کے لیے یہ تینوں چیزیں معتبر اور مستند نہیں......؟؟

شبلی نعمانی مصر اور روم کے سفر کے بعد اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔ اس سفر سے میرے دل پر جو اثر ہوا' وہ ہزار کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا مجھ کو معلوم ہوا کہ انسان جب تک دنیا کے بڑے بڑے حصے نہ دیکھ لے انسان نہیں ہوسکتا افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چار دیواری میں بسر ہوتی ہے......

گویا کہ شبلی نعمانی کے نزدیک انسان ہونے کی شرط ''مسافر'' ہونا ہے......سیروفی الارض کا ارشاد ذہن میں رکھیں تو مسافرت میں وہ چیز ہے جو انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اقبال شناس کی حیثیت سے منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں ان کے اسی وصف کی بناء پر 1991ء کے آخر میں انہیں قرطبہ کی بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کا موقع ملا اگر کسی سچے اقبال شناس کو اچانک اقبال کے خوابوں کی سرزمین......اندلس......کی سیر و سیاحت کا موقع مل جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نعمت غیر مترقبہ کے حصول کی اسے کس قدر خوشی ہوگی......اندلس کے سفر نامے اُردو زبان میں دو چار ہی ہیں کسی میں حال ہے اور کسی میں ماضی......مگر اس سفر نامے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں ماضی اور حال دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں مسافر کی آنکھ گرد و پیش کے مناظر پر مرکوز رہتی ہے اور اس کا ذہن تاریخ کے اوراق پلٹتا رہتا ہے۔ اس ورق گردانی میں اسے اقبال سے راہنمائی ملتی ہے اس طرح سے سفر نامہ تاریخ اور ادب کا ایک ایسا مرقع بن جاتا ہے جسے سفر نامہ کی بجائے ''عشق نامہ'' کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اور قارئین عشق بھی کونسا'' جو اقبال کی زبان میں

عشق سراپا، دوام جس میں نہیں رخت و بود......

جی سفر نامے کے تعارف کے بعد آگے چلتے ہیں یہ ایک روداد سفر ہے خوابوں کی سرزمین اندلس کی اور روداد بھی ایسی کہ جتنی دفعہ پڑھوئی لذت پاؤ......(مصنف نے اسے لکھنے پر نقوش ایوارڈ پایا تھا)۔ زیر نظر سفر نامہ بہت ہی دلچسپ ہے......فطری انداز میں جا بجا شعروں کے نگینے فِٹ کر کے معلومات فراہم کرتے ہوئے آخری ''صفحے تک'' قاری کے ذہن کو اپنے سحر میں رکھتا ہے۔ لاہور سے روانگی اور قرطبہ تک پہنچنے میں ہر مرحلہ، مرحلہ شوق ہے۔ ساتھ میں ماضی کی سیر بھی جاری ہے۔ مزہ دو آتشہ ہو جاتا ہے لکھتے ہیں۔ قرطبہ اب بھی بارہ پندرہ گھنٹے کی دوری پر تھا اچانک مجھے خیال آیا، علامہ اقبال کو انگلستان سے ہسپانیہ پہنچنے میں کتنا وقت لگا ہوگا؟ مزاجاً وہ ''گل محمد'' قسم کے انسان تھے سفر و حرکت سے نفور۔ 'سفر مجبوراً' ہی کرتے انگلستان سے واپسی پر انہوں نے ہسپانیہ کا عزم کیا اور ۲۵ روز میں اندلس کے پانچ شہروں کی تفصیلی سیاحت کی یہ ان کے غیر معمولی عزم و ہمت کا ثبوت ہے کیونکہ 60 سال پہلے سفر کی مشکلات کہیں زیادہ تھیں......اب مجھے ندامت کا احساس ہوا......سفر پھر سفر ہے ہم زائرین اندلس سفر شوق پر نکلے تھے سو مشکلات سفر کا شکوہ کیسا!

قارئین بہترین سفر نامہ نگار وہ ہوتا ہے جو جسمانی اور روحانی دونوں آنکھیں کھلی رکھے...... یہ سفر نامہ ان میں سرفہرست ہے...... پورے سفر میں مسافروں کا مشاہدہ بھی خوب کیا گیا ہے۔

''جہاز میں بہت سی نشستیں خالی تھیں مسافروں میں غیر ملکی اور ہسپانوی زیادہ تھے اور سب مجھے ایک جیسے ہی لگ رہے تھے گندمی مائل یا پکی گوری رنگت کی وجہ سے یا شاید اس لئے کہ بیشتر مرد و زن اپنا پسندیدہ نیلا لباس پہنے ہوئے تھے۔ کوٹ پتلون سکرٹ، جرسی سب کا رنگ نیلا۔ سفر اندلس کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ لباس کے معاملہ میں نیلا رنگ ہسپانیہ والوں کو بہت مرغوب ہے۔ ہسپانیہ (اب اسپین) اندلس......مسلمانوں کے عروج کی داستان......نسیم حجازی اور اقبال کو پڑھنے والے بھلا اس نام کی اہمیت کیوں نہ جانیں گے''۔ خود منصف اپنے دوست کی ۱۹۸۸ء کی کہی بات کو دہراتے ہوئے کہتا ہے۔

ہاشمی صاحب! دو وقت کی بجائے ایک وقت کا کھانا کھایئے بچت کیجئے اور ہسپانیہ ضرور دیکھئے۔

زیتونوں کا شہر قرطبہ......کارڈوبا کتابوں میں اس کے معنی لکھے ہیں The Place of Gold......عبدالرحمان الداخل محمد بن ابی عامر، ابن رشد، ابن حزم کا قرطبہ......علامہ قرطبی، زہراوی کا قرطبہ جہاں دنیا کی سب سے خوبصورت مسجد تعمیر ہوئی۔ کعبہ ارباب فن، سطوت دین حسین جس کے پہلو میں مدینۃ الزہراء

جیسا عدیم النظیر شہر تعمیر ہوا اور پھر ایسا اجڑا کہ فاعتبرو یا اولی الابصار، قرطبہ جو دسویں صدی عیسوی میں ترقی و خوشحالی اور عظمت کی معراج کو پہنچا اور ایسا علمی مرکز بنا کہ پورے یورپ کے تشنگان علم اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔

جن کی نگاہوں نے کی تربیت مشرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ میں

قارئین لہور، لہور اے کے حلقہ ء اثر سے نکلیں تو قرطبہ بھی کم نہیں وہی قرطبہ جس کے متعلق علامہ اقبال نے ہسپانیہ کی ۲۵ روزہ سیاحت سے واپس جاتے ہوئے مدیر انقلاب کو لکھا تھا کہ ''مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو......''

قرطبہ کی سرزمین پر ہر نظارے کو ہاشمی صاحب اتنے دلچسپ اور سادہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ آنکھوں دیکھا محسوس ہوتا ہے۔قرطبہ کا ایئرپورٹ ہو یا ہوٹل ہر جگہ کی منظر کشی خوب کی گئی ہے۔اصل مقصد وہ کانفرنس ہے جو اقبال کے متعلق تھی اور وہاں روانگی کی وجہ بھی ...... اس کانفرنس میں اُردو ادب کا ذوق رکھنے والا قاری اپنے آپ کو موجود پاتا ہے۔ ہاشمی صاحب نے بحُسن خوبی کانگریس کی گھر بیٹھے یوں شرکت کروائی ہے کہ اپنے آپ کو ''مندوب'' قرار دینے میں ذرہ بھر تامل نہیں ہوتا۔اس کانگریس میں اُردو ادب سے تعلق رکھنے والا برصغیر کا ہر بڑا نام موجود ہے۔مثلاً پروفیسر جگن ناتھ، ڈاکٹر سعید اختر درانی، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور پسرِ اقبال یعنی ڈاکٹر جاوید اقبال وغیرہ۔کتاب کے مصنف، پروفیسر مرزا محمد منور (اُردو ادب بالخصوص نظریہ پاکستان سے وابستہ اس نام کو ذہن میں لاتے ہی ان کی عظمت کو سلام کرنے کو دل چاہتا ہے) اور سہیل عمر کے ہمراہ اس کانگریس میں شریک ہوئے...... یہ ''تکونی'' جوڑی کتاب کے اختتام تک قاری کو اپنے علم کا اسیر رکھتی ہے۔کتاب کے شروع ابواب میں ''قرطبہ'' کے بارے میں اس قدر محققانہ اور مئورخانہ مواد موجود ہے کہ اس موضوع پر اگر کوئی مائی کالال پی ایچ ڈی کرنا چاہے تو دعا ہی دے گا۔

اس کانفرنس کے دوران ہم وطنوں کو فخر کے قابل لمحات ملے ہوں یا نہ ملے ہوں شرمندگی کے مواقع اکثر ملے ہیں جیسا کہ یہ سطور'' کانفرنس کے وقفے میں جنگ لندن کے انور خالد اور بی بی سی کے رضا علی عابدی شرکائے کانفرنس کے تاثرات ریکارڈ کر رہے تھے کچھ حضرات تصاویر بنا، بنوا رہے تھے، مندوبین کے گروپ کی تصاویر بھی بنائی گئیں (کتاب میں موجود ہیں) کسی نے بتایا فرانسیسی، ہسپانوی اور تیونس ٹیلی ویژن کے نمائندے بھی اس کانفرنس کی روداد رپورٹ کرنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر درانی نے بھی اقبال اکادمی برطانیہ کی جانب سے کانفرنس کی وڈیو فلم تیار کرنے کا اہتمام کیا اس کے ناظم مصطفیٰ علی خان تھے لیکن وطن عزیز کے کسی اخبار یا ریڈیو ٹی۔وی کا کوئی نمائندہ موجود نہ تھا جیسے اقبال سے پاکستان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو یا للعجب ...... کانگریس میں ایک موقع پر موسیو لامان نے معنی خیز بات کی۔

Iqbal was not the Poet of the East. He was the Poet of th West.

(اقبال کو شاعر مشرق نہ کہیے وہ تو مغرب کے شاعر تھے)

اقبالیات سے شغف رکھنے والوں کو علم ہو کہ پروفیسر ابن میری شمل بھی موجود رہیں اور جلسہ کی صدارت کا شرف حاصل کیا۔

کتاب میں ہوٹل گران کپی تان میں مندوبین کے اس مشاعرے کا ''روح پرور'' ذکر بھی موجود ہے جس میں افریقی عرب سامع نے جوش میں آکر ''منہ زبانی'' عربوں کے غرناطہ چھوڑنے کی یاد میں عرب شاعر کے نوحے سے لے کر اکبر ترسون زادہ کی فارسی رباعیاں قطعے، فرانسیسی مندوب دیسولیر کا گارسیا لورکا کی شاعری شامل ہے۔اقبال کی یاد میں اس بین الاقوامی مشاعرہ کے بعد 'ل مسکیتا' کے عنوان سے قرطبہ کی سیاحت کا حال موجود ہے۔قرطبہ کا ذکر ہو اور عبدالرحمان داخل کو 'بے دخل' کر دیا جائے؟ تعمیر مسجد کے لیے داخل کے عشق کا یہ عالم تھا کہ روزانہ خود بھی معماروں اور مزدوروں کے شانہ بشانہ کام کرتا......اس نے دو سال کی قلیل مدت میں تعمیر مسجد پر ۸۰ ہزار دینار صرف کیے۔علامہ اقبال کو داخل میں ''مرد خدا'' کی جھلک نظر آئی تو بے جا نہ تھا۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مسجد کا صحن ''نارنگیوں کا باغیچہ'' کہلاتا ہے گھاس کے تین قطعوں میں زیادہ تر نارنگیوں کے درخت تھے چند ایک کھجور کے پرانے وقتوں کی یادگار زیتون کا درخت بھی باقی تھا...... درمیانی باغیچے میں تالاب جس کے چاروں کونوں سے پانی ٹونٹیوں کے ذریعہ تالاب میں جمع ہو رہا تھا وسط میں فوارہ......

مسجد کے بیشتر دروازے مستقل طور پر بند ہو چکے ہیں چند دروازوں میں تو دیوار بھی چن دی گئی ہے......! لیجئے قارئین اب مسجد کو دیکھ کر احساسات مسجد کے جلال و شکوہ سے ہیبت اور رعب کا احساس ہو رہا تھا۔اس میں خوف کا عنصر نہ تھا بلکہ یہ اس تعجب پر مبنی تھا جو کسی نئ 'انتہائی انوکھی' منفرد و نایاب اور یگانہ و بے مثال شے کو دیکھ کر انسان پر طاری ہوتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ کیا روئے زمین پر اور اس کائنات میں یہ کچھ بھی موجود ہے...... تاہم مسجد کی روائتی روشن فضا ناپید تھی نیم روشن نیم تاریک ماحول میں ایک الجھن سی ایک گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی تاہم قطار اندر قطار ستونوں اور ان کے اوپر سلسلہ در سلسلہ محرابوں کا دل کش نظارہ دامن دل کھینچ رہا تھا...... اولین تاثر میں جلال و شکوہ غالب تھا اب آہستہ آہستہ جمال و زیبائی کا کرشمہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ذہن بے اختیار اقبال کے شعر کی طرف منتقل ہو گیا۔

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

ہمارا رخ الحکم ثانی کے توسیع کردہ حصے میں واقع محراب کی طرف تھا سر گھما کر دائیں دیکھتے، کبھی بائیں، کبھی اونچی محرابی چھتوں پر نظر ڈالتے، بعض حصوں کی چھتیں منقش لکڑی کی تھیں۔ستونوں کے اوپر چھت تک محراب در محراب کا سلسلہ صناعی اور فن تعمیر کا نوکھا مظاہرہ تھا۔ستون انتہائی ٹھوس اور قیمتی پتھر کے تھے مسجد کے مختلف حصوں میں ان کی رنگت جدا جدا تھی۔بعض گنبدوں کے اندر بنی ہوئی محرابوں اور ان کے اطراف میں نقاشی و خطاطی اور پچکاری کا کام اس باریک بینی اور مہارت سے کیا گیا تھا کہ ناظر کے لیے مبہوت ہوئے بغیر چارہ نہ تھا۔مگر یہ ضرور ہے کہ اس وقت جو کچھ سامنے تھا وہ کاری گری و صناعی، جلال و جمال، حسن وزیبائی اور رعنائی کا پیکر نظر آیا۔

ہے تہہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کوئی

ایک روایت کے مطابق اس محراب میں یہ صنعت موجود ہے کہ اس کے اندر کھڑے ہو کر جو تلاوت کی جائے یا بات کی جائے وہ مسجد کے آخری گوشوں تک سنائی دیتی ہے۔

قارئین! جس مسجد کو دیکھ کر شاعر مشرق پر ہیبت طاری ہو جائے وہ اپنے بیٹے جاوید اقبال کو نصیحت کریں میں شکر گزار ہوں کہ اس مسجد کو دیکھنے کیلئے زندہ رہا، خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو......'' لگتا ہے یہ مسجد ان کے دل میں کھُب گئی تھی۔کعبہ ارباب فن، سطوت دین مبین (اقبال ہی کیا جس نے بھی دیکھا اس کا یہی حال ہوا......ق۔ر)

افسوس صد افسوس ...... اے مسلمان......! آج اس مسجد و محراب کی روشنیاں گُل ہیں جگہ جگہ ستونوں اور دیواروں کے ساتھ صلیبیں، یسوع مسیح اور مقدس مریم کے مجسمے اور مختلف تصاویر آویزاں ہیں جگہ جگہ چھوٹے معبد (Chapels) اور قربان گاہیں (Altars) بنی ہیں۔ان میں سے بیشتر مسیحی ولیوں (Saints) اور بزرگوں سے منسوب ہیں۔تھوڑے فاصلے پر واقع عجائب گھر (Treasure Chambes) میں مسیحی تبرکات کا قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔

طوائف الملوکی کے زمانہ میں جب مسلم اندلس کے مختلف شہر عیسائیوں کے سامنے سرنگوں ہوتے جا رہے تھے۔اس زمانہ میں اندلس کے مشہور محدث عالم ادیب اور شاعر ابوعبداللہ بن الابار مراکش کے شاہ ابوزکریا کے پاس پہنچے اور اسلامی اندلس کا دردناک مرثیہ پیش کیا جس کا ایک شعر،

یا للمساجد عادت للاعداءِ بیعا
وللنداءِ غدا اثناء ما جرساً

(آہ وہ مساجد جنہیں دشمنوں کے گرجوں میں بدل دیا اور اذان کی جگہ وہاں گھنٹیاں بج رہی ہیں) شاید اسی لیے ہمارے آنجہانی وزیر اعظم نے بھی اذان بجنے کا لفظ استعمال کیا تھا۔

پیارے قارئین! کسی قوم کی تاریخ فرد کے حافظے کی مانند ہوتی ہے...... یادداشت ختم ہو جائے تو بندہ ''ککھ'' کا نہیں رہتا......اور جب قوم تاریخ کا سبق اور سفر بھول جائے تو وہی ہوتا ہے جو آج امت مسلمہ کا حال ہے......

جناب مصنف نے مسجد قرطبہ کی تین دفعہ زیارتوں کے بعد جو بیان جاری کیا وہ یہ ہے۔مسجد قرطبہ کی ایک لمحہ کی زیارت ہزاروں صفحوں پر مشتمل عبارتوں کے مطالعہ سے ارفع و اعلیٰ، مسجد قرطبہ دیکھنے کی، محسوس کرنے اور ایمان تازہ کرنے کی خیر ہے۔قارئین! مسجد قرطبہ کے ستونوں کی تعداد بارہ سو سے زائد ہے اس مسجد کی تعمیر چار مرحلوں میں مکمل ہوئی چھت یکساں تقریباً سینتیس فٹ بلند ہے......اس کے بعد ہاشمی صاحب کا قلم مسجد کی شان و شوکت کا مظاہرہ بیان کرنے کے لیے رواں ہو گیا۔لیکن صد افسوس یہ شان و شوکت مسلمانوں کا ماضی ہے۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

مسجد میں اذان دعا خصوصاً نماز با جماعت ادا کرنا ممنوع ہے لیکن یہاں پہنچ کر کم از کم دو نفل ادا کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔شیخ منظور الٰہی صاحب کی روایت ہے کہ سلطان سعود ہسپانیہ کا سرکاری دورہ کر رہے تھے وہ اپنی جماعت کے ساتھ مسجد قرطبہ داخل ہوئے تو نماز کا وقت آ گیا۔سلطان نے نماز ادا کرنے کے لیے پروٹوکول کے افسران سے اجازت چاہی تو انہوں نے معذرت کی کہ مسجد اب کلیسا میں تبدیل ہو چکی ہے۔سلطان کا چہرہ تمتما اٹھا انہوں نے کہا ''میں اس رسولﷺ کی امت سے ہوں جس نے نصرانیوں کے وفد کو مسجد نبوی میں عبادت کرنے کی اجازت دی تھی اور تم مجھے اپنی ہی مسجد میں نماز ادا کرنے سے روکتے ہو؟

سلطان نے ایک مصاحب کو اذن اذان دیا اور یوں سات صدیوں بعد مسجد کی خاموش فضاؤں میں اذان کی صدا گونجی۔

اس کے بعد مصنف نے ان بہت سے عام و خاص لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے سلطان سعود کی پیروی کی کوشش کی مگر پھر کیا ہوا؟ ظاہر ہے یہ سب کتاب میں آپ کے پڑھنے کے لیے موجود ہے۔

قرطبہ کے بعد مشہور شہر مدینۃ الزہراء ہے اس کی سیر و سیاحت اپنی جگہ

بڑی دلچسپ اور ''سبق آموز'' ہے۔اس شہر کی تعمیر پر اپنے دور کی خوش حال ترین مملکت کی ایک تہائی آمدنی خرچ ہوتی رہی تھی اس کی تزئین و آرائش پر الناصر نے عمر عزیز کے ۲۵ سال اور الحکم ثانی نے ۱۵ سال صرف کر دیئے کبھی وہ شاہان قرطبہ کے لیے تفریح گاہ تھا اب بس اس لائق رہ گیا کہ مندوبین چند لمحوں کے لیے رک کر اس پر نگاہ غلط انداز لیں۔ اندلس کے شاعر ابوالبقا نے مرثیے میں لکھا:۔

ہر شے جب کمال کو پہنچ جائے
تو پھر اس کے لیے زوال مقدر ہے
سو انسان آسودگی حیات کے فریب میں نہ آئے

قارئین! ہر قوم کا الگ مزاج ہوتا ہے (ہر فرد کی طرح) ہسپانیہ کے مسلمان مساجد کی تعمیر کے سلسلہ میں اس وقت کی گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں سرفہرست تھے۔اب مدینۃ الزہراء کی جامع مسجد کو لیجئے ایک ہزار افراد کی شب و روز کی محنت سے ۴۸ دن میں تیار ہوئی۔

کتاب کے بقیہ ابواب اسپین کے مسلمان حکمرانوں کے نظم و نسق ان کی عادات و مشاغل کے بارے میں ہیں جو اپنی جگہ عبرت آموز ہیں۔ مغلیہ بادشاہوں کی طرح یہ حکمران بھی فن تعمیر سے بہت شغف رکھتے تھے۔قصر الزہراء کی تعمیر میں الناصر کا انہماک اس قدر بڑھ گیا کہ دو تین ہفتے نماز جمعہ میں بھی نہ پہنچ سکا اس کے بعد جب مسجد میں آیا تو منذر نے قرآن و حدیث کے پردے میں ایسی سخت تنبیہ کی کہ سارے نمازیوں اور خود الناصر پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔
(آج کے حکمران......کاش......کاش......کاش)

ایک موقع پر جب ایک قصیدہ گو شاعر نے (ہمارے حکمرانوں کے مشیروں کی مانند) ان عمارات کی تعمیر کو دین و دنیا کے فروغ کا باعث بتایا اور الناصر جھومنے لگا تو منذر بن سعید نے اٹھ کر چند اشعار پڑھے۔

اے الزہرا کے بانی! تو اپنا سارا وقت اس میں صرف کرتا ہے۔
کیا تجھے ہوش نہیں آئے گا:
سبحان اللہ! اس کی رونق کیا خوب ہے:
بشرطیکہ اس کا پھول (الزہرا) کمہلا نہ جائے

الناصر نے کہا ان شاء اللہ یہ کبھی نہیں کمہلائے گا (میں نے آج تک لفظ کملائے پڑھا تھا...... ہاشمی صاحب نے کمہلائے لکھا ہے تو، مستند ہے ان کا فرمایا ہوا......) مگر الناصر کی وفات کو پچاس برس بھی نہ گزرے ہوں گے کہ الزہراء، پتھروں اور راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے......فاعتبروا یا اولی الابصار

یہ سفرنامہ معلومات کا ایک خزینہ ہے مسلمانوں کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے شاید ہی اس سے بہتر سفرنامہ مارکیٹ میں دستیاب ہو۔الحکم ثانی کے ذاتی معالج ابوالقاسم الزہراوی کے ایجاد کردہ آلات جراحی کے ماڈل اور فن جراحی پر 30 جلدوں میں تحریر کردہ دائرہ معارف اس کی غیر معمولی مہارت کا ثبوت ہے۔

کتاب ابن رشد، ابن خرم کے بارے میں مصنف کا نقطہ نظر بہت اچھے انداز میں سموئے ہوئے ہے......ابن رشد اپنے فلسفہ کو صرف اس صورت میں کامیاب قرار دیتے ہیں جس کی بنیاد سائنس، تجربے اور منطق پر ہو اور وحی الہٰی کی روشنی میں ہو۔

موجودہ اسپین اس میں موجود مسلمانوں کی تعداد ان کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کے بعد وہ اسپین کے لوگوں کے طرز بود و باش سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں ان کی نظر اگر مقامی باشندوں کی زبان اور لباس پر ہے تو ان کے گھروں میں پاتیو (بیرونی صحن میں پھلوں، پھولوں سے آراستہ قطعہ زمین جسے ہمارے ہاں پے شیو کہا جاتا ہے)

لیجئے قارئین! صفحات کا دامن تنگ پڑ گیا جبکہ بجز ندامت کے پاس کیا ہے کہ کتاب پر اصل تبصرہ تو اب شروع ہونے والا تھا جس میں شہروں کی دلہن، غرناطہ (نسیم حجازی کے ناولوں کا شہر) الحمراء (جو کہ قلعہ محلات اور باغات کا مجموعہ ہے) جسے دفاعی مقاصد کے لیے بنایا گیا ۲۷ میٹر بلند ۱۶ میٹر چوڑا چار منزلہ واچ ٹاور والا الحمراء موجودہ بنیادوں پر 1238ء میں محمد بن الاحمر نے تعمیر کیا......قرطبہ کے بعد غرناطہ کی سیر بہت دلچسپ ہے۔ہاشمی صاحب ماضی کی معلوماتی سیر کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات، جذبات کو بھی ''رواں مبصر'' کی طرح ساتھ ہی شیئر کرتے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے پہلے مجھے مرزا محمد منور (مرحوم) اور ہاشمی صاحب بڑے ادیب لگتے تھے......اب میں ان کی معتقد ہو گئی ہوں۔

کتاب کے اختتام پر مصنف نے فرانس کے دورہ کے ضمن میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے ملاقات کا بہت تفصیلی ذکر کیا ہے اور کتاب کے اختتام تک میں کئی دفعہ رکی ہوں...... میں نے اپنے ماضی ......شاندار ماضی میں جھانکا، چلتے پھرتے کرداروں سے گفتگو کی، اور سوچا کہ جب اس سفرنامہ پر کالم لکھوں گی تو یہ کتنی اقساط پر مشتمل ہو گا......صرف ایک قسط پر! اس لئے کہ کتاب کی ونڈو شاپنگ کرا دی ہے اب باقی آپ کی مرضی پر۔

کتاب لیجئے کتاب پڑھیئے اور کتاب پڑھنے کے لیے آگے دیجئے کہ شاید یہی صدقہ جاریہ بن جائے۔

☆......☆......☆

عظمٰی پروین

باہمی حقوق سے متعلق احادیث کے مطابق

اہلِ جنت کون؟

حضرت جاہمہ نے جہاد میں شرکت کے متعلق بات کی۔ نبیؐ نے پوچھا ''تمہاری والدہ زندہ ہیں؟'' عرض کیا ''جی ہاں'' فرمایا: ''تو پھر جاؤ اور انہی کی خدمت میں لگے رہو۔ کیونکہ جنت انہی کے قدموں میں ہے (ابن ماجہ، نسائی)

''جس عورت نے بھی اس حالت میں انتقال کیا کہ اُس کا شوہر اُس سے راضی اور خوش تھا وہ جنت میں داخل ہوگی'' (ترمذی)

''یہ عورتیں اول بچے کو پیٹ میں رکھتی ہیں، پھر جنتی ہیں، دودھ پلاتی ہیں، پھر اُن کے ساتھ کتنی محبت اور مہربانی کرتی ہیں، اگر اُن کا شوہروں سے برتاؤ برا نہ ہو تو اُن میں سے جو نماز کی پابند ہیں سیدھی جنت میں چلی جایا کرتیں'' (مسند احمد، ابنِ ماجہ)

''جس شخص کی بیٹی ہو پھر نہ تو وہ اسے زندہ دفن کرے نہ اسے ذلیل سمجھے اور نہ اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح دے تو اللہ اُسے جنت میں داخل کرے گا'' (ابوداؤد)

''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا'' (ترمذی)

''تین باتیں ہیں جس میں وہ پائی جائیں اللہ اُس کی موت کو آسان بنا دیتا ہے اور اُسے جنت میں داخل کرتا ہے کمزوروں سے نرمی، والدین سے شفقت اور غلاموں سے حسنِ سلوک'' (ترمذی)

''باپ جنت کے دروازوں میں سے بہتر دروازہ ہے'' (ترمذی)

''جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا، صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنے ہی کے لیے پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا، ہر ہر بال کے بدلے اُسے نیکیاں ملیں گی، اور جس نے اپنے پاس رہنے والے کسی یتیم بچے یا بچی سے حسنِ سلوک کیا تو میں اور وہ جنت میں ان دو (انگلیوں) کی طرح ہونگے (آپؐ نے اپنی دو انگلیوں کو ملایا)۔ (مسند احمد، ترمذی)

عرض کیا گیا: ''یا رسولؐ اللہ! فلاں عورت دن کو روزے رکھتی ہے، رات کو قیام کرتی ہے لیکن ہمسائیوں کو اذیت پہنچاتی ہے'' فرمایا: ''یہ عورت جہنم میں ہے'' پھر کسی دوسری عورت کے بارے میں عرض کیا گیا ''فلاں عورت صرف فرض نماز ادا کرتی ہے اور پنیر کے ٹکڑے وغیرہ صدقہ کرتی ہے لیکن ہمسائیوں کو اذیت نہیں پہنچاتی'' فرمایا: ''یہ عورت جنتی ہے'' (احمد)

جنت میں جانے والے تین قسم کے لوگ ہیں ''حاکم انصاف کرنے والا، سچ بولنے والا، جسے نیکی کی توفیق دی گئی، وہ شخص جو ہر قرابت دار اور ہر مسلمان کے لیے مہربان اور نرم دل ہو، وہ شخص جو پاکدامن ہے اور عیالداری کے باوجود کسی سے سوال نہیں کرتا'' (مسلم)

''میں تمہیں اُس آدمی کی پہچان بتاتا ہوں جس پر جہنم کی آگ حرام اور وہ آگ پر حرام ہے یہ وہ آدمی ہے جو نرم مزاج ہو، نرم طبیعت ہو اور نرم خو ہو'' (ترمذی)

''ہر وہ شخص جو نرم دل ہے، شریف النفس ہے، منکسر المزاج ہے اور لوگوں سے قریب ہے اُس پر جہنم کی آگ حرام ہے'' (مسند احمد)

''قیامت میں خدا فرمائے گا وہ لوگ کہاں ہیں جو صرف میرے لیے لوگوں سے محبت کیا کرتے تھے آج میں اُن کو اپنے سائے میں جگہ دوں'' (مسلم)

''جو شخص انتقام لینے پر پوری طرح قادر تھا لیکن غصہ پی گیا (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ اُسے ساری مخلوق کے سامنے بلائیں گے اور اُسے حورعین منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے گا کہ جس سے چاہے نکاح کرلے'' (مسند احمد)

''جس نے کسی بھائی کی عدم موجودگی میں اُس کی عزت سے برائی کو دور کیا اللہ پر اُس کا حق ہے کہ وہ اُسے آگ سے آزاد کردے'' (احمد)

''مریض کی عیادت کرنے والا جب تک واپس نہ آجائے تب تک جنت کے باغ میں رہتا ہے'' (مسلم)

''جس نے جھوٹ چھوڑ دیا اس حال میں کہ وہ باطل ہے اُس کے لیے بہشت کے گردونواح میں گھر بنایا جائے گا، جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دیا اُس کے لیے بہشت کے وسط میں گھر بنایا جائے گا'' (ترمذی)

''ایک درخت مسلمانوں کو تکلیف دیتا تھا ایک شخص آیا اُس نے وہ درخت کاٹ دیا اور جنت میں چلا گیا'' (مسلم)

''سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ، جب لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو گے'' (ترمذی)

پوچھا گیا '' مجھے ایسے عمل کی رہنمائی فرمائیں جو مجھے جنت میں لے جائے'' فرمایا ''غصے میں نہ آیا کرو پھر جنت تمہاری ہے'' (طبرانی)

☆......☆......☆

(۱) ہمارے ٹی وی چینلز پر کیا دکھایا جارہا ہے

ایک جائزہ

(۲) اُف یہ چینلز

ذرائع ابلاغ کو ریاست کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ آج کے دور میں میڈیا نے عوام الناس کو آگاہی دینے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ پرائیویٹ ٹی وی چینلز نے معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کیا، بہت سے پروگراموں کے اینکرز نے اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈال کر بھی اپنا فرض ادا کیا۔ اسی طرح مختلف آسمانی آفات مثلاً زلزلہ، سیلاب وغیرہ کے دوران بھی میڈیا کا کردار قابلِ رشک رہا ہے۔ فاٹا اور دوسرے شمالی علاقہ جات میں رپورٹنگ کرنا انتہائی جان جوکھوں کا کام ہے مگر صحافی حضرات ان مشکل حالات میں بھی اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھاتے چلے آئے ہیں۔ عراق ہو یا افغانستان یا غزہ کی پٹی پر معصوم انسانی جانوں کے ضیاع کا معاملہ ہو، اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی ان علاقوں کی درست تصویر کشی کرنے کی کوشش قابل فخر ہے۔

اس سب کے باوجود موجودہ دور میں میڈیا پر بڑھتی ہوئی فحاشی اور عریانی کے نظارے پر ذی شعور انسان کو ٹی وی پروگراموں کا درست تجزیہ کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ درست سمت کا تعین کر لینا کہ ہم کہاں ہیں اور یہ میڈیا ہمیں کہاں لے جانا چاہ رہا ہے وقت کی ضرورت بن چکا ہے۔

ہمارے پرائیویٹ ٹی وی چینل اور قومی چینل پر دکھائے جانے والے پروگراموں کا جائزہ لیا جائے تو ایسے لگتا ہے کہ وزارتِ اطلاعات اور پیمرا کو شاید یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ہم اپنے عوام اور اپنی آنے والی نسلوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ ذیل میں تمام دن دکھائے جانے والے پروگراموں اور ان کے موضوعات کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

صبح کے پروگرام:

صبح 9 بجے سے تقریباً 11 یا 12 بجے تک تقریباً تمام نجی و قومی چینلز پر مارننگ شوز چل رہے ہوتے ہیں جو زیادہ تر بے مقصد ہوتے ہیں الا ماشاءاللہ ہر چینلز پر شادی ہو رہی ہوتی ہے۔ اس عظیم مقصد کیلئے جن کی شادیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔ ان کی بھی دوبارہ کروائی جاتی ہیں۔ رشتے کروانے والی خواتین کئی چینلز پر نظر آتی ہیں۔ اگر شادی کا پروگرام نہ ہو تو فیشن انڈسٹری کو سپورٹ کرتے ہوئے ڈریس شو یا میک اپ جیولری کے استعمال کے طریقے بتا کر عوام کی خدمت کی جاتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ شادیوں میں جو کپڑے استعمال کیے جاتے ہیں یا ڈریس شو میں بھی جن کپڑوں کی نمائش کی جاتی ہے وہ ہمارے ملک کے 98 فیصد عوام کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ میک اپ کے طریقوں کے ساتھ ہونٹ دلکش بنانے کے طریقے، آنکھوں کے گرد جھریاں دور کرنے کے طریقے، بوڑھی بلکہ ضعیف خواتین تک کو جوان بنانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جاتا ہے۔ چینلز پر گھریلو مفید ٹوٹکے بتائے جا رہے ہیں جو کہ یقیناً فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ چینلز پر باقاعدہ غیر اسلامی کلچر کو فروغ دینے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔ جیسے ہندو، سکھ وغیرہ۔ پروگرام کے آخر میں میزبان ان کے ساتھ ناچ ناچ کر باقاعدہ اپنی نیک تمناؤں کا پیغام دیتی نظر آتی ہے جبکہ دوسری طرف انڈیا میں پاکستانی اداکاروں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ بھی سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

حالات حاضرہ:

ہر دن سے متعلق اہم ایشو پر پروگرام کیے جاتے ہیں جن میں معروف سیاستدانوں، سوشل ورکرز، فوج کے اداروں سے متعلق

افسران، معروف اینکرز وغیرہ کو مدعو کر کے ان سے ٹیبل ٹاک کی جاتی ہے۔ ان پروگراموں میں اکثر میزبان اپنے پسندیدہ نظریات رکھنے والے شخص کو تو ٹائم دے دیتے ہیں مگر اگر کوئی اختلاف رائے رکھتا ہو تو زیادہ تر اسے وقت ہی نہیں دیا جاتا اور پھر دوسرے کی بات سنے بغیر ہر کوئی اپنی بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے پروگراموں میں بھی اکثر ''مچھلی بازار'' والی صورتحال دیکھنے میں آئی ہے۔ ایسے ہی ایک پروگرام میں تقریباً سال بھر ''امن کی آشا'' کا راگ آلاپا جاتا رہا ہے مگر عوام جانتے ہیں کہ دوسری طرف سے اس کا جواب ''جنگ کی بھاشا'' کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہی چینل جو ''امن کی آشا'' کے بھارتی ایجنڈے پر مسلسل نیک نیتی سے کام کر رہا ہے۔ اسی کے ایک پروگرام میں معروف انڈین سیاستدان نے کہا تھا:

Pakistanis are no more welcome in India

اس بھارتی ایجنڈے کی آڑ میں بھارت کیلئے تجارتی منڈی فراہم کرنا اور اس کے ہتھکنڈوں کے خلاف رائے ہموار کرنے کیلئے فوج پر ڈرامائی انداز میں الزامات لگائے جاتے رہے ہیں۔

کارٹون:

بچوں کی تفریح ہی نہیں بلکہ اصلاح کا بھی ایک اہم وموثر ذریعہ ہے۔ ہمارے ہاں جتنے کارٹون چینلز چلتے ہیں ان پر غیر ملکی کارٹون ہی دکھائے جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے بچوں کو وقت سے پہلے عشق اور معاشقے سکھائے جاتے ہیں۔ ہم اپنے دور میں انکل سرگم اور ماسی مصیبتے کو دیکھا کرتے تھے اور سیکھا بھی کرتے تھے۔ اسی طرح ''عینک والے جن'' کا انتظار کرتے تھے۔ اس طرح تفریحی و اصلاحی دونوں مقاصد پورے ہو جاتے تھے۔ بچوں کی تربیت کے پروگرام زیادہ ہونے چاہئیں تاکہ نئی نسل کی بہتر رہنمائی وتربیت کی جا سکے۔

موسیقی:

پاکستانی چینلز پر موسیقی کے پروگرامز انڈین پروگراموں کی نقل ہیں۔ غیر شریفانہ ماحول، فحش فقرے اور غیر معقول لباس استعمال کیا جاتا ہے۔ نئے گلوکاروں کو آگے آنے کا موقع دیا جاتا ہے یہ اچھی بات ہے مگر اپنی اقدار کا پاس ضرور رکھنا چاہیے۔

5۔ جرم وسزا:

جرم و وارداتوں سے متعلق پروگرامز ہر ٹی وی چینل کی ضرورت بن گئے ہیں۔ ان پروگراموں کے ذریعے جرائم پیشہ افراد کو میڈیا تمام لوگوں کے سامنے آنے کی دعوت دیتا ہے اور اس طرح نوجوان نسل کو جرائم کرنے کے عام و نت نئے طریقے مل جاتے ہیں۔ جرائم سے متعلق عام سی خبر کو بھی سنسنی پھیلا کر توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے پروگراموں کے ذریعے معاشرے میں منفی رویے عام ہو رہے ہیں۔

جیو ایف آئی آر، واردات، اندھیری راتوں میں، کوئی دیکھے نہ دیکھے شبیر تو دیکھے گا۔ اس سلسلے کے اہم پروگرامز ہیں جو کہ دکھائے تو عوامی شعور بیدار کرنے کیلئے جاتے ہیں، مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح کچھ اور بتا رہی ہے۔

جادو اور توہمات:

جادو اور اس طرح کی دوسری غیر مرئی چیزوں سے متعلق پروگرامز بھی کئی چینلز باقاعدہ نشر کرتے ہیں۔ دوسری طرف ٹاک شوز کے اندر ان کی دھوکے بازیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اس موضوع پر ڈرامے بھی دکھائے گئے۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ گزشتہ دنوں جعلی عاملوں کے ذریعے بچیوں کے پامال ہونے کے واقعات زیادہ ہونے لگے۔ غیر مرئی چیزوں کے متعلق پروگرام بھی ذہنوں پر انتہائی منفی اثر ڈالتے ہیں۔

''راز'' ''وہ کیا ہے'' ''مانو یا نہ مانو'' اس قسم کے پروگراموں کی مثال ہیں۔ جن باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں ایسے پروگرامز بند ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ ستاروں کا حال جاننا، آپ کا یہ ہفتہ کیسا گزرے گا اور خواہ وہ میچ فکسنگ ہو یا سیاسی شخصیات کے حالات اور خواہ وہ طوطے کے ذریعے ہی جانے جائیں مگر آسٹرالوجسٹ اور پامسٹ حضرات کی خوب چاندی ہے۔ ہر چینل ایک پامسٹ کو بٹھا کر لوگوں کے حالات بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ جو کوئی کاہن کے پاس گیا اور اس کی پیشن گوئیوں کی تصدیق کی اس نے اس تعلیم سے کفر کیا جو محمدؐ پر نازل ہوئی۔ مسلمانوں کے معاشرے

میں ایسے پروگراموں کا نشر کیا جانا لمحہ فکریہ ہے۔

ڈرامے:

یہ میڈیا Content کی سب سے پُر اثر قسم ہے۔ عوامی تفریح اور اثر و نفوذ کے اعتبار سے یہ انتہائی طاقتور رہا ہے۔ گزشتہ دور میں بھی معاشرتی موضوعات پر اچھے ڈرامے دکھائے جاتے رہے ہیں۔ بہت سے پاکستانی ڈرامہ سیریل اور سیریز پڑوسی ملک میں انتہائی مقبول رہے مثلاً تنہائیاں، دھوپ کنارے، الف نون، ففٹی ففٹی، سونا چاندی وغیرہ۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، فاطمہ ثریا بجیا، انور سجاد، یونس جاوید اور منو بھائی کے ڈرامے ملک بھر میں اور بیرون ملک بے حد مقبول رہے آج کل دکھائے جانے والے ڈرامے، ڈرامہ نگاروں، موضوعات اور مقصدیت تینوں لحاظ سے اس پائے کے نظر نہیں آتے۔ البتہ عمیرہ احمد کے ڈرامے استثنیٰ رکھتے ہیں۔

جو غیر ملکی ڈرامے دکھائے جارہے ہیں نہ ان کی تہذیب ہم سے ملتی ہے اور نہ ان کا لباس اور رہن سہن، ان کے معاشرتی موضوعات ہماری معاشرت سے میل کھاتے ہیں۔ میرا وزارت اطلاعات سے سوال ہے کہ جب ڈراموں کا بہت ہی اہم ورثہ ہمارے پاس موجود ہے تو ہمیں یہ ڈرامے باہر سے منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ انڈین ڈراموں کے بے شمار چینلز آن ایئر ہیں پھر ہمارے ٹی وی چینلز پر بھی انہی ڈراموں کو دکھایا جاتا ہے۔ صرف ڈرامے ہی نہیں بلکہ ٹاک شو اور ڈانس شوز بھی دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر ڈراموں میں جو لباس استعمال کیا جارہا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔ دوپٹہ تو شلوار قمیص کے ساتھ شاید ڈیزائنرز نے بنانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ شیطان کا پہلا حملہ حیا پر ہوا اور اس نے آدم علیہ السلام اور حوا علیہ السلام کو بے لباس کر دیا تھا۔ وہ جنت کے درختوں کے پتوں سے اپنا آپ چھپانے لگے۔ پیمرا سے گزارش ہے کہ لباس کے معاملہ میں کوئی اخلاقی ضابطہ وضع کریں تاکہ گھر کے تمام افراد ساتھ بیٹھ کر ٹی وی کے پروگرام دیکھ سکیں۔

طنز و مزاح:

مختلف ٹی وی چینلز پر طنز و مزاح کے مختلف پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہم سب امید سے ہیں، خبرناک، حسب حال، میڈیا آزاد ہے، مذاق رات، ڈارلنگ وغیرہ ان تمام پروگراموں میں خیال رکھنا چاہیے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو اور مزاح ایسا ہونا چاہیے کہ انفرادی طور پر کسی شخصیت پر حملہ نہ کیا جائے۔ نیز مزاح اور پھکڑ پن میں فرق رہے اور عریانی اور فحش گفتگو سے پرہیز کیا جائے۔

خواہ پروگراموں کی نوعیت کچھ بھی ہو، ان کے لیے ضابطہ اخلاق ہونا ضروری ہے۔ نیز معاشرتی اقدار کو ختم یا تبدیل کرنے کی شعوری کوشش ختم ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ مذہبی پروگراموں کی آڑ میں کمرشل ازم کی دوڑ قابل مذمت ہے۔ آن سکرین ضرورت مند مساکین کی مدد کرے ان کو یوری دنیا کے سامنے بے عزت ہونے سے بچائیں۔ حدیث ہے کہ ''ایک ہاتھ دے تو دوسرے کو خبر نہ ہو'' اکثر میلاد کے پروگرام میں مرد و خواتین کو اکٹھا دکھایا گیا جو مذہبی اقدار کے ساتھ بھونڈا مذاق ہے۔ گزشتہ رمضان میں انیق ناجی کا پروگرام ''تلاش'' اچھا رہا۔ اسی طرح ''پیغامِ صبح'' دنیا چینل پر بے حد موثر اور مقبول پروگرام ہے۔ پیمرا کو چاہیے کہ:

1۔ ہمارے ٹی وی چینلز پر ہالی وڈ اور بالی وڈ کی نقل کا جو عنصر غالب آتا جا رہا ہے اس پر قابو پائے۔ ٹاک شوز ہوں، یا معلوماتی پروگرام، ڈرامے ہوں یا دیگر تفریحی شوز، ہماری اپنی ملکی ضروریات و ثقافت کے مطابق ہونے چاہئیں۔

2۔ کمرشلز سے لے کر ڈراموں اور تمام پروگراموں میں ساتر اور مشرقی لباس کے استعمال کی پابندی کروائی جائے۔

3۔ اپنے علیحدہ قومی تشخص کی حفاظت کی جائے۔ انڈین اور ترکی کے ڈراموں کو بند کیا جائے۔

4۔ جرائم و وارداتوں سے متعلق پروگرام ختم کر کے تعمیری اصلاحی پروگرام چلا کر عوام میں مثبت سوچ کو فروغ دیں۔

5۔ جذبہ حب الوطنی بیدار رکھنے کیلئے ملی نغموں، ملکی سیاحتی علاقوں کی سیر، پاکستان کے مختلف صوبوں میں موجود ثقافتی ورثے کی ترویج اور اس طرح کے دوسرے پروگرام پیش کیے جائیں تاکہ جذبہ حب الوطنی کو فروغ ملے اور ملک کے مختلف علاقوں میں موجود خلیج کو دور کرنے میں میڈیا اپنا مثبت کردار ادا کرے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہر باشعور شہری کا فرض ہے کہ جو پروگرامز بھی وہ دیکھتے ہیں۔ان میں کیا اچھا ہے اور کیا بُرا اور وہ کیسے پروگرامز دیکھنا چاہتے ہیں، اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار پیمرا کے Toll Free 0800-73672 اس نمبر پر ضرور کریں۔اور معاشرے میں شعوری طور پر پھیلائی جانے والی برائی و بے حیائی کے کاموں کے خلاف عملی تحریک میں شامل ہو کر اپنا فرض ادا کریں۔حدیث مبارکہ ہے:

''جب تم کوئی برائی دیکھو تو اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرو۔ اگر ہاتھ سے نہ روک سکو تو زبان سے روکو اور اگر زبان سے بھی نہ روک سکو تو دل میں اسے بُرا جانو مگر یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

آپ کی اور میری ذمہ داری ہے کہ خاموش رہ کر برائی کا حصہ بننے سے بچیں۔

(مسز ارشد)

☆......☆......☆

(۲)

ابتدا میں جب ٹیلی ویژن ایجاد ہوا تو اس کی افادیت کے ساتھ اس کے نقصانات زیادہ بتائے جا رہے تھے۔یہ بتایا جا رہا تھا کہ اس سے نکلنے والی شعاعیں اتنی تیز ہوتی ہیں کہ اگر نوزائیدہ بچہ دیوار کی دوسری طرف سو رہا ہو تو ریز دیوار سے گزر کر بچے کے جسم میں داخل ہو سکتی اور اسے نقصان پہنچا سکتی ہیں:...... پاکستان میں ابتداً ٹی وی اس طرح متعارف کرایا گیا کہ اسے چوراہوں اور مرکزی مقامات پر آویزاں کیا گیا اور لوگ اس کے گرد کھڑے ہو کر پروگرامات دیکھا کرتے تھے اس طرح ذہنوں کو آہستہ آہستہ تیار کر کے ترغیب دی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہر گھر کی زینت اور پھر ضرورت بن گیا۔

شروع میں اس کا مقصد علمی، معلوماتی اور تفریحی بتایا گیا اور اصل مقصد پوشیدہ رکھا گیا کیونکہ رہنمائی کرنے والے کہہ رہے تھے کہ پاکستان جیسا معاشی طور پر کمزور ملک اس مہنگی تفریح کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اس کے ذریعے جو معاشرتی اور تمدنی خرابی پیدا ہوگی اسے روکنا مشکل ہوگا۔لیکن حکومت کے پیش نظر پس پردہ اصل مقاصد کچھ اور تھے۔

ایک تو اس کے ذریعے لوگوں کو ذہنی طور پر مصروف کر کے اس تنقید سے روکنا تھا جو لوگوں کی طرف سے دستور کی خلاف ورزیوں اور معاشرے میں برپا برائیوں پر کی جاتی تھی۔حکومت کو اس دباؤ سے نکالنا تھا جس میں حکومت وقت تنقید و تبصرے کی وجہ سے مبتلا رہتی تھی۔

دوسری وجہ عوام الناس کو علماء کے اثرات سے نکالنا تھا جو شرعی و معاشرتی معاملات میں عوام کی رہنمائی کرتے تھے اور ان کے دائرہ اثر میں ہونے کی وجہ سے ان کے کہنے پر عمل کرتے تھے۔یہ بات خود ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم کرتے وقت اس کے چیئرمین نے سارے اسٹاف کو بذریعہ خط بتائی تھی کہ پاکستان میں یہ سفید ہاتھی کیوں پالا جا رہا ہے تاکہ یہاں مذہبی زور کو توڑا اور لادینی نظریات کو پھیلایا جا سکے۔وہ خط آج بھی ریکارڈ پر موجود ہے اور آج یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہے جو کچھ کیا جا رہا ہے جو کچھ سنایا اور دکھایا جا رہا ہے اس سے اصل مقصد پوری طرح واضح ہو رہا ہے کہ مقدر ذہنی تفریح نہیں ذہنی عیاشی ہے۔تمدن کی بہتری اور ترقی نہیں تہذیب و اخلاق کی بدترین تنزلی ہے۔اب اس کی ریز سے زیادہ نقصان دہ اس سے امنڈنے والا بے حیائی، فحاشی و عریانی کا وہ سیلاب ہے جس میں ہر گھر کا باسی غرقاب ہو رہا ہے اور ذہن و دل ایسے مسخر ہوئے ہیں کہ تہذیب و اخلاق کی بربادی و محرومی کا احساس بھی نہیں۔

پی ٹی وی کی حد تک تو معاملہ پھر بھی قابل برداشت تھا مگر خودرو پودوں کی طرح اگ جانے والے پرائیویٹ چینلوں نے تو کہیں کا نہ رکھا ساری حدود و قیود یکسر ختم ہو گئیں۔حسن کا فرق ہی مٹ گیا پہلے سر سے دوپٹہ سرکا اور پھر شانہ بھی اس کے بوجھ سے آزاد ہوا اور اب لباس مختصر ہو کر باعث رسوائی بنا ہوا ہے''یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ شرمائیں یہود'' فحش منظر بیہودہ مکالمے اور بے حیاء کردار کے ساتھ آنے والی جنس کو دیکھ کر شیطان بھی آنکھیں بند کر کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔ ہر وقت کی بے ہنگم اچھل کود کے ساتھ دکھائے جانے والے اشتہارات جو چیزوں سے زیادہ بے حیائی کے اشتہار بنے ہوئے ہیں۔ڈراموں میں والدین سے بغاوت کرتی اولاد، شوہر سے جھگڑا کرتی بیوی، باپ کو بھیڑیا کہتی بیٹی، خاندانی وقار کو خاک میں ملاتی ناخلف اولاد، ہر چیز ہر وقت پردۂ سیمیں پر موجود، اپنے ماحول، اپنی روایات، اپنی تہذیب اور اپنے دین سے بغاوت کی دعوت دے رہی ہے۔ مارننگ شو کا نام دے کر صبح

کے قیمتی اوقات میں فلم اسٹاروں سے لایعنی گفتگو اور بیہودہ ہنسی مذاق، پکوان کی اونچی دکان سجا کر کھانے والوں کی اونچی اڑان کے ساتھ وقت گزاری۔

پرائیویٹ چینلز کی اجازت کیا ملی گویا ترک تہذیب و اخلاق کا پروانہ مل گیا جیو اور جینے دو کا نعرہ لگا کر ''جیو'' چینل شرم وحیا کا حصار توڑتا ہوا میدان میں آیا تو گویا ہر پہلوان نے اکھاڑے میں نہ آنا اپنی توہین سمجھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سے ایک چینل کھلتے ہی چلے گئے۔ آج نے کہا جو کچھ ہونا ہے آج ہی ہو جائے کل کا کون انتظار کرے۔ جس چینل کو کھولیں اداکاروں، گلوکاروں، رقاصوں کا مینا بازار لگا ہوا ہے۔ آؤ اور پاؤ کی رعایتی سیل لگی ہوئی ہے سب پورے زور وشور سے اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں ایسے ہی خوشنما ناموں سے نہ جانے کتنے چینلز ہیں جن کی چال اور جال میں ہم آپ گرفتار ہو چکے ہیں۔

اور اب ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

پی ٹی وی پر آپ تنقید وتبصرہ کر سکتے تھے۔ لعن طعن کے ٹوکرے برسا سکتے تھے۔ حدود وقیود کا پابند ہونے کا مطالبہ کر سکتے تھے ان پر قانون کے ذریعے گرفت کر سکتے تھے کیونکہ وہ قانوناً اخلاقی حدود کے پابند ہیں۔ لیکن ان پیدائشی آزاد چینلوں کو آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر وہ رات کو دن کہیں تو آپ مان لیجئے اور کہیے کہ ہاں اس وقت سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ مغربی ملکوں میں پرائیویٹ چینلز نے جو تباہی مچائی ہے اس سے وہاں کے لوگ پریشان ہیں اور مطالبے کر رہے ہیں کہ اس کو ختم کیا جائے یا اس کی تعداد گھٹائی جائے لیکن ہمارے ہاں ایسا کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ وہ گندگی جسے مغرب والے صاف کرتے ہیں پاکستان کے کوڑادان میں پھینک دیتے ہیں اور ہم روادار لوگ ہیں اسے اٹھا کر چوم لیتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب پی ٹی وی پر دینی پروگرام اور مذہبی گفتگو کے لئے مولانا شاہ بلیغ الدین، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا احتشام الحق تھانوی جیسے عالم دین آتے تھے۔ اب ان کی جگہ لادینی نظریات رکھنے والے نام نہاد مولانا آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اداکاروں، مسخروں اور بھانڈوں سے مذہبی امور پر گفتگو کی جاتی ہے۔ عید و بقرعید کے خالص مذہبی تہوار کے خصوصی دن پر فلم اسٹاروں کے ساتھ محفل سجائی جاتی ہے اب ذرائع ابلاغ کے محکمے کو دینی اسلامی اور ایمانی افکار ونظریات رکھنے والوں سے پاک کر دیا گیا ہے۔ پھر بھلا آپ شکایت کس سے کریں گے۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا؟ یہ وہ سیل بلا ہے جس پر بند باندھنا انتہائی ضروری ہے مگر اس بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟

(ذکیہ فرحت)

☆......☆......☆

ڈائری کا ایک ورق

ڈاکٹر گلشن حقیق مرزا کی ڈائری سے

12 بجے شب

آج۔ زندگی ...... اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت کو پائے آٹھ دہائیاں گزر گئیں۔

اس فانی زندگی کے بیش بہا لمحات کو کیسے گزارا؟ کیا کھویا؟ کیا پایا؟ ایک مبہم سوال ہے۔

اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں صرف یہ سمجھنا اور محسوس کرنا، دل سے ادراک کرنا کہ حق کیسے ادا کیا؟ شکر گزاری کیسے نبھائی؟

زندگی کی مقصدیت کو سمجھنے اور پانے کے لیے کتنی محنت کی؟ کتنی جان لڑائی؟ اپنے خالق و مالک و قادرِ مطلق سے لَو لگانے کو کیسے اپنی دُنیاوی خواہشات کے طوفانِ بلاخیز سے نکال کر ترجیح دی۔

اے اللہ! صرف تو ہی جانتا ہے میرے اعمال کو، میری سوچ، سمجھ اور افکار کو۔ میری غلطیوں، کوتاہیوں کو، اور جانے انجانے میں اٹھائے گئے غلط اقدامات کو۔

یا رب العالمین! یا رحمان و رحیم، یا غفور الرحیم تو معاف فرمانا پسند فرماتا ہے تو غفار ہے، ستار ہے، تیری رحمت بے پایاں ہے۔ میری دل سے نکلی ہوئی توبہ قبول فرما۔ صغیرہ کبیرہ گناہوں کو معاف فرما دے۔ اور لغزشوں، کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ اور زندگی کے بقایا لمحات اپنی رضا کے مطابق گزارنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔ اور شکر گزاری۔ احکامات کی اطاعت، اپنے پیارے نبیؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما دے (آمین ثم آمین)

حقوق کی ادائیگی میں جو اَن گنت کوتاہیاں ہوئی ہونگی۔ معاف فرما دے اپنے عزیز و اقارب اور اپنے مریضوں کے حقوق کی ادائیگی میں کہیں لغزشیں ہوئی ہونگی۔ اسے معاف کروانے کی مہلت عطا فرما۔

میرے بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال میں جو لغزشیں ہوئی ہونگی اس کا مداوا کرنے کیلئے رہنمائی عطا فرما۔

ان سب کو اپنے نیک اور خالص پارسا باعمل بندوں میں شامل فرما۔ انہیں دین و دنیا کی بہترین نعمتوں اور رحمتوں سے ہمیشہ مالا مال فرما اور انہیں ہمیشہ میری آنکھوں اور دل کی ٹھنڈک بنا رہنے دے اور ہمارے لئے صدقہ جاریہ بننے کی توفیق عطا فرما (آمین ثم آمین) امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مطابق وقت کے صحیح استعمال کیلئے رہنمائی عطا فرما اور ہمت، جرأت و استقامت عطا فرما۔ مصلحت اندیشی سے بچالے اور دنیا کے گورکھ دھندوں اور محتاجی سے جان چھڑا کر خالص اپنا فرمانبردار اور شکر گزار بندہ بننے کی توفیق عطا فرما۔ اور سکون و اطمینان کی دولت سے مالا مال رکھ۔

خاتمہ بالایمان ہو۔ کلمہ طیبہ آخری وقت نصیب ہو۔ رَبَّنا اٰتِنا **فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار اللهم اجرنی من النار.** (آمین ثم آمین)

مرسلہ: فلزہ آفاق

☆......☆......☆

امید پہ دنیا قائم ہے!

(زینب بتول۔ ریاض)

تقریباً ہر محفل میں ہی میری وہ عزیز دوست اپنے بڑھتے وزن کا ذکر لے کر بیٹھ جاتی...... اور بڑی ہی حسرت بھری اُمید سے ہم لوگوں سے سوال کرتی۔ ''سنو! تم لوگوں کو میرا وزن کچھ کم لگا؟ پورے ہفتہ بھر سے واک کر رہی ہوں......''

میرا تو دِل ہی بیٹھ جاتا کہ اُسے حوصلہ دوں یا مایوس کروں۔ مگر کوئی نہ کوئی بامروّت سہیلی پورے شدّ و مد سے اُسے یقین دِلانے لگتی۔''

ہاں! ہاں! مجھے تو بہت فرق لگا ہے، دیکھو...... یہاں سے تمہاری

قمیص بھی کھلی لگ رہی ہے۔ بس چند دِن کی بات اور ہے۔'' اِن طفل تسلّیوں کے بعد ہمیشہ کی طرح اُس پر ہر طرف سے وزن کم کرنے کے ٹوٹکوں کی بوچھاڑ ہو جاتی جس میں سے پورا تو کوئی ٹوٹکہ بھی اُس کی سمجھ میں نہ آتا۔ لیکن ایک اُمید ضرور بندھ جاتی سمارٹ ہونے کی...... اور اُمید پر دُنیا قائم ہے!

ویسے ہم نے ہمیشہ ہی یہ دیکھا کہ ناشکری اور دُنیاداری کے اِس معاشرے میں...... اپنی چیز کی نسبت دوسرے کی چیز اچھی، دوسرے کا گھر خوبصورت، دوسرے کی سجاوٹ اعلیٰ، اور تو اور بچوں کو بھی دوسرے بچے کی پلیٹ ہی زیادہ بھری ہوئی لگتی ہے۔ مگر ''وزن'' ایک ایسی چیز ہے کہ ہمیشہ اپنا ہی زیادہ لگے گا۔ ایسے مکالمے ہر موقع پر ہی سماعت سے گزرتے ہیں...... ''بھابھی! آپ تو ماشاء اللہ بڑی سلِم ہیں...... کیا ڈائٹنگ کرتی ہیں؟''

''مِسز احمد کی سمارٹنس کا کیا راز ہے؟ غالباً جم وغیرہ جاتی ہوں گی۔''

''بہن...... آج کل بڑی پریشان ہوں۔ میرے شوہر اُٹھتے بیٹھتے مجھے بڑھتے وزن کے طعنے دینے لگے ہیں۔ سوچ رہی ہوں، واک شروع کردوں۔ کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟''

غرضیکہ تمام ٹوٹکے، اِرادے، عزائم دہرا کر ذہن میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں...... عمل میں تب ڈھلیں گے جب ''قسمت'' ہوگی۔ البتہ زبان کا چسکا پورا ہوجاتا ہے۔ صاحبو! نیند اچھی آتی ہے...... خاص طور پر کسی دعوت میں ڈھیروں ڈِشوں کو ''چکھنے'' کی سنت پوری کرنے کی کوشش میں ہر آئٹم سے انصاف کرنا، میزبان کے محبت بھرے اصرار پر مہمان کا ''سات آنتوں سے کھانا'' اور پھر ''سویٹ ڈِش'' کے مرحلے پر کہنا...... ''سوری! میں میٹھا نہیں لوں گی۔ میرا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ مائنڈ مَت کیجیے گا۔'' یہ سب موجودہ دور کے اقدار و روایات کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔

اِس موضوع کا حق اَدا نہ ہوگا اگر ہم ''ٹریڈمِل'' کا ذکر نہ کریں۔ یہ کہانی بھی عجیب ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں ایک رجحان یہ بھی شروع ہوگیا ہے کہ جیسے ہی آپ کا وزن بڑھنا شروع ہو، یہ ایکسرسائز سائیکل یا ٹریڈمِل لے کر گھر میں رکھ لی جائے۔ ایک آدھ دفعہ استعمال سے کوئی بَل پڑ گیا یا کوئی اور اندرونی مسئلہ...... بس اَب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں...... ہمارا گوشت مشین کو دیکھ کر ڈرتا رہے گا...... بڑھے گا نہیں! بھلا ہو موجودہ دور کے ''شوہرانِ نامداران'' کا...... جو اگر بولنے سے پہلے سوچ لیا کریں اور غلطی سے بھی اپنی ''نصف بہتر'' صاحبہ کے وزن کی طرف اشارہ نہ کیا کریں۔ تو یہ مصیبت اُن کے گلے نہ ہی پڑے۔ نہ تو بیوی کے ساتھ واک کر کے اپنی جان گلانی پڑے نہ ٹریڈمِل کا خرچہ! وہ نہیں جانتے کہ بیوی کو انہوں نے کِس ''عمر بھر کے فوبیے'' سے دوچار کر دیا ہے۔ میرا تو یہ سوچ کر دِل ہول جاتا ہے کہ موجودہ صدی میں یہ نت نئے کھانے، ترکیبیں، آئے روز کی سیلیں اور بڑھتے ہوئے وزن کی وجہ سے موٹاپے کا فوبیا نہ ہوتا تو آخر ہم آپس میں کیا گفتگو کرتے؟

☆......☆......☆

مہمان کی رُخصتی پر

(ڈاکٹر مسز آفاق، لاہور)

رمضان المبارک، گیارہ ماہ کے طویل انتظار کے بعد آنے والا وہ مہمان ہے کہ جس کی رخصت کے وقت لگتا ہے کہ ابھی تو آیا تھا اور بس ابھی چل دیا۔ اس کے ساتھ گزاری ہوئی ساعتوں کی رونق، گہما گہمی، مصروفیت، سحری، افطار، تراویح، دورۂ قرآن اور ذکر دعائیں۔ روح کے ساتھ ذہن اور جسم کو بھی تروتازہ کر دیتی ہیں اور نئے ولولوں کے ساتھ پھر سے سفر شروع ہوتا ہے۔ ایسے کہ زادِراہ میں نیکیوں کو قائم رکھنے، بڑھانے کی تمنا اور بُرائیوں کو دبانے اور کم کرنے کی آرزو شامل ہوتی ہے۔ دورۂ قرآن کی محفلوں کی کثرت کو دیکھ کر آج سے تیس سال پہلے کا وہ وقت یاد آ گیا جب یہ طریق کار لوگوں کے لیے مانوس نہ تھا اور غالباً پہلی دفعہ منصورہ لاہور میں شیخ الحدیث مولانا گوہرالرحمٰن (مرحوم) نے نصف شعبان سے اواخر رمضان تک دورۂ قرآن کا آغاز کیا۔ پھر یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا بعد نمازِ فجر اُن کی رُعب دار آواز میں، قرآن کا پیغام، توحید کا سبق، قرآنی آیات کا موجودہ دور پر انطباق، دل میں اترتا اور ذہن کی گہرائیوں میں پیوست ہوتا جاتا۔ پھر رات کو مسجد کے صحن میں

تراویح اور ساتھ ساتھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں محترم قاضی حسین احمد کی تشریح اور دعائیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کو اس کی صحیح روح کے ساتھ سمجھنے، اس پر غور کرنے عمل کرنے اور آگے پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہمیں قرآن کی نعمتِ عظیم کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اُمت مسلمہ اپنے عظیم مشن کی تکمیل کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر اس شمعِ ہدایت سے دنیا کے اندھیروں کو روشنی سے بدلنے کی کوشش کرے اور ہم ایمان اور دین کی سربلندی کو تمام دنیوی مفادات اور ذاتی اغراض پر ترجیح دینے والے ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے دین کی سربلندی کے لیے کام کرنے والوں کو فتح و نصرت عطا فرمائے۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں، کوتاہیوں، لغزشوں سے درگزر فرمائے اور اپنے دین کی سربلندی کے لیے مل کر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہماری ادنیٰ کوششوں کو قبول فرمائے اور اُمت مسلمہ کو اندرونی و بیرونی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ ہمیں حق کو حق دکھانے اور اس کا اتباع کرنے کی توفیق دے۔ اور ہمیں باطل کو باطل دکھانے اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (خواہ یہ ہمارے نفس میں ہو یا باہر کے ماحول میں)۔ آمین!

گلشن کی آبرو

کچھ دن سے آ گئی ہوں اپنے نئے چمن میں
اس کو سجا رہی ہوں گہری لگن مگن میں
سوکھا ہوا چمن تھا پانی کا منتظر تھا
پانی اسے لگایا سرسبز اس کو پایا
گلشن میں پھول کھلنے کی منتظر رہی میں
لیکن اس انجمن میں مشکل سے پھول پایا
موسم بہار کا ہے پھولوں کی انجمن ہے
لیکن میرے چمن میں گل کھل نہ پا رہے ہیں
رب سے مِری دعا ہے گلشن میرا سجا دے
صحنِ چمن میں میرے خوش رنگ گل کھلا دے
بے رنگئِ چمن میں مجھ کو بہار دے دے
فطرت کے رنگ دے دے ہر سو نکھار دے دے
قدرت تیری یہاں ہے فطرت کی سادگی میں
ڈالی کی زندگی ہے پھولوں کی دل لگی میں
یارب گلِ چمن سے ڈالی کو مُشکبو رکھ
پھولوں کی تازگی کو گلشن کی آبرو رکھ

(جویریہ شریف)

بے حجابی

(فرزانہ خالد۔ کراچی)

ہماری کینٹین بند کر دی گئی۔ ہمارے استفسار پر بتایا گیا کہ کینٹین میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹیبلز مختص کر دی گئی تھیں جس پر شدید ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر یہی سوچا اس فتنے کا حصہ بننے سے بہتر ہے کہ اسے بند کر دیا جائے۔ ہم دِل پر بوجھ لیے واپس لوٹے کہ کیا مخلوط تعلیم کے بعد اب نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا آزادانہ میل جول، ایک ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، ہنسی مذاق کرنا کسی طور قابل گرفت نہیں رہا؟ مائیں اپنی ذمہ داری سے نظریں چُرا رہی ہیں یا وہ خود اس کے نتائج سے بے بہرہ ہیں؟

حجاب قطعاً کسی جبر یا پابندی کی علامت نہیں ہے اسے اختیار کرنا ہمارے لیے باعثِ فخر ہونا چاہیے۔

پیارے نبیؐ نے فرمایا ''ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیاء ہے''۔ حیاء سے مراد وہ شرم ہے جو کسی گناہ کی جانب راغب ہونے سے پہلے انسان خود اپنی فطرت کے سامنے اور خدا کے سامنے محسوس کرے۔ جھوٹ، بدعہدی، بداخلاقی اور بے حیائی کے کام کرنے سے پہلے ہی احساس جُرم ہونے لگے تو یہ حیا کی نشانی ہے۔

ہم لباس کے معاملے میں دوبارہ دورِ جاہلیت میں جا رہے ہیں۔ نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب مرد و زن خانہ کعبہ کے گرد برہنہ طواف کیا کرتے اور اس کو باعث اجر و ثواب سمجھتے تھے اُس دور کی جاہل عورتوں کا لباس بھی غیر ساتر ہوتا تھا۔ سینے کا کچھ حصہ کھلا رہتا، بازو کمر اور پنڈلیوں کے بعض حصے کھُلے رہتے۔ آج ہمارے ہاں لباس ہی

معاشرے کا پہناوا بنتا جا رہا ہے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہیں اور دوسروں کو رِجھائیں اور خود دوسروں پر ریجھیں اور بختی اونٹ کی طرح ناز سے گردن ٹیڑھی کر کے چلیں وہ جنت میں ہرگز داخل نہ ہوں گی اور نہ ہی اس کی بو پائیں گی۔''

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے عید کے دن ان کو حبشیوں کا تماشا دکھایا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ عورتوں پر غضِ بصر کی ویسی سختی نہیں ہے جیسی مردوں پر ہے لیکن ایک مجلس میں مل کر بیٹھنا، نظر جما کر دیکھنا اور روبرو بیٹھ کر ہنسی مذاق، لایعنی گفتگو کرنا، فتنے کا موجب بنتا ہے۔ ایسی محافل ہی سے بے حیائی اور بے غیرتی کی شروعات ہوتی ہے۔ نتیجتاً وہ دلخراش مناظر سامنے آتے ہیں کہ جن کا تصور محال ہے۔ ساحل سمندر ہو یا کوئی بھی پکنک پوائنٹ، فوڈ کارنر، یا شاپنگ مال نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ملاقاتوں کے اڈے بن چکے ہیں۔ ایسی تمام درس گاہیں قابل مذمت ہیں جہاں مخلوط معاشرت کو رواج دیا جا رہا ہے۔

☆......☆......☆

محشرِ خیال

فرحت طاہر۔کراچی

اکتوبر کا بتول کل شام وصول ہوا۔ یہ وہ سوغات ہے جس کا انتظار اور طلب مہینے کے آغاز سے ہی ہونے لگتا ہے مگر ہاتھوں میں اس وقت پہنچتا ہے جب مہینہ ڈھلنے کی تیاری میں ہوتا ہے۔لہٰذا تبصرہ کرنے کی نہ مہلت نظر آتی ہے اور نہ ہمت پڑتی ہے۔ بہرحال اس دفعہ سب کچھ پس پشت ڈال کر قلم اٹھالیا ہے۔

قانتہ رابعہ کا شکوہ بالکل بجا ہے لیکن اس کا جواب خود ان کے خط میں ہی موجود ہے یعنی بتول کا تاخیر سے قارئین تک پہنچنا۔ پڑھنے کو تو شاید ایک نشست میں پڑھ لیا جاتا ہے مگر تبصرہ لکھنے کا بالکل وقت نہیں ہوتا کیونکہ اس کو فائنل کرتے کرتے اگلا شمارہ پریس میں جاچکا ہوتا ہے۔ اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی کسی شائق کو دینا پڑتا ہے اور اگر ایک مہینہ کا نہ ملے تو پھر آپ کو کہیں سے نہیں ملتا۔ یعنی مختصر یہ کہ قلت بھی مسئلہ ہے۔ ترسیل میں بہتری اور اضافہ ہی مسئلہ کا حل ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ شمارہ آن لائن ہو جائے تاکہ جس کو سہولت ہو وہ اس پر پڑھ سکے۔ ضرور اس پر سوچیں اور عمل کی کوشش کریں۔

قانتہ رابعہ کا بہت شکریہ کہ وہ ہر اس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں جس پر ہر حساس دل ضرور بے چین ہوتا ہے۔ اس دفعہ آپ نے ہوسٹس کی کہانی لکھی ہے۔ واقعی حوا کی بیٹی کی یہ ذلت سفر کی ساری خوشگواری کو ختم کر دیتی ہے۔ اللہ آپ کے زور قلم کو توانا اور تندرست رکھے ظاہر ہے اس میں جسمانی صحت کی دعا خود شامل ہے!

شگفتہ نقوی کا قلم بھی خوب ہے کبھی رلاتا ہے اور کبھی مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بیگ کا سفر جیسی شگفتہ تحریر پڑھ کر ہمیں بھی اپنا اس سے ملتا جلتا واقعہ لکھنے کا دل چاہا مگر کیا کریں ان جتنی ہمت نہیں ہے ان افراد پر لکھنے کی جن کی لاپروائی نے بچّی کے کپڑے اس وقت پہنچائے جب وہ اس کے لیے بے کار ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ آسٹریلیا پہنچ گئیں اور ہم ان سے اجتماع عام میں ملنے کی امنگ لیے رہ گئے۔ خیر وہ جہاں رہیں اپنے قلم کے ذریعے ہم تک پہنچتی رہیں گی۔ ان شاءاللہ۔

وہ تحریر جو ایک ساتھ کئی جگہ پڑھی اس کے بارے میں بجا طور پر قاری یہ سوچتا ہے کہ ان صفحات پر کوئی اور تحریر آجاتی تو زیادہ مطالعہ کی تسکین ملتی۔ بہت مصروف افراد اپنی تحاریر کا فالو اپ نہیں رکھ پاتے چنانچہ اس معاملے میں تھوڑا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ مصنفّہ اور مدیرہ دونوں کی ذمہ داری ہے۔ دعا ہے کہ ہمارے کاموں میں بہتری پیدا ہو۔

باقی رسالہ بہت اچھا ہو گیا ہے۔ آسیہ راشد نمایاں خواتین کے نام سے بے پناہ معلومات فراہم کرتی ہیں اللہ جزائے خیر دے۔ ان کے انٹرویوز بھی بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ افشاں نوید، شمیم فاطمہ، ام ایمان اور بشریٰ تسنیم تو ہمارا سرمایہ ہیں۔ اللہ ان کو مزید تقویت دے کہ اس خزانے میں اضافہ کرتی رہیں۔ نوجوان نسل کی خواتین کے لیے مریم کشور کا مضمون رہنمائی کا کام کرسکتا ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے۔

اس دعا کے ساتھ کہ رسالہ کو دن دونی اور رات چوگنی رعنائی عطا ہو اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ ہاں ایک بات، حریم ادب کے فیس بک صفحہ پر بتول پر ماہانہ تبصرہ شائع کیا جارہا ہے۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے والی خواتین ضرور اس کو وزٹ کریں اور اپنی رائے سے نوازیں۔

مدیحۃ الرحمان۔منکیرہ

سب کے ایمان وصحت کی سلامتی کی دعائیں۔ 9 تاریخ کو اکتوبر کا ''بتول'' ملا۔ سرورق پر نظر دوڑائی تو جی خوش ہو گیا، بلکہ افشاں نوید، ڈاکٹر شگفتہ نقوی اور ''قانتہ رابعہ'' ...... یہ نام پڑھ کر تو مانو منہ میں پانی آ گیا۔ سب سے پہلے قانتہ آنٹی کی لائبریری سے ''خواب منزل'' پہ بھرپور تبصرہ پڑھا اور لطف آ گیا۔ ڈاکٹر شگفتہ سے دل کا رشتہ اتنا پیارا ہے کہ ان کی کتاب پہ کیا گیا تبصرہ میں نے یوں پڑھا جیسے میری ذاتی کتاب پہ کیا گیا ہو۔ پھر ''بیگ کے سفر'' نے خوب ہنسایا، دلچسپ اندازِ تحریر اور شگفتگی کا بھرپور احساس لیے ہوئے ''بڑوں کی بات مان لینی

چاہیے'' عمدہ سبق تھا۔ پڑھنے کے بعد دل بے طرح اداس ہوا......ڈاکٹر صاحبہ کی یاد میں حالانکہ اُسی دن اُن سے بات بھی ہوئی تھی۔ ''افشاں نوید'' کا نام ہی کافی ہے۔ بہت ہی عام سمجھی جانے والی باتوں کو بہت ہی خوبصورت الفاظ کا پیراہن دے کر گویا قاری کے دل کو مٹھی میں کر لیتی ہیں۔ کالم کے آخر میں نظم بھی بڑی عمدہ تھی......آنٹی کہاں سے ڈھونڈتی ہیں ایسی شاعری؟ ''فتنوں سے آگاہی'' بھی بہترین تحریر تھی۔ اُن کی دونوں تحاریر پڑھ کر دل سے ان کے لیے دعائیں نکلیں۔ اُن کا قلم سدا چلتا رہے۔ (آمین) بلکہ میں نے دیگر افراد کو بھی بطورِ خاص ''تضاد'' پڑھایا اور سب ہی اُن کے ہمنوا بن گئے۔

قانتہ آنٹی کا افسانہ بھی بہترین پیغام لیے ہوئے تھا۔ بلاشبہ اِن تینوں لکھاریوں کے قلم سے نکلا ہر لفظ موتی کی مانند ہے، اندھیرے میں روشنی جیسا ہے...... بہت سی میٹھی اور پیاری خوشبو دیتے الفاظ جو سیدھے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ باقی سب نے بھی اچھا لکھا۔ مجموعی طور پر اکتوبر کا شمارہ مجھے بہترین لگا۔ اس لیے پہلی دفعہ تبصرہ کرنے کی ٹھانی۔ لکھنا وِکھنا مجھے نہیں آتا۔ اب پتہ نہیں اِتنی محبت سے کیے گئے اِس تبصرے کا نصیب ردی کی ٹوکری بنتا ہے یا ''بتول'' کے صفحات!!

☆......☆......☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

خودکار نظام دفاع

جب آدم وحوا اور شیطان کو زمین پر اتارا گیا تو دونوں فریق (انسان، شیطان) ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہو گئے اور مشیّت ایزدی بھی یہی تھی کہ دونوں کو اختیارات کی آزادی دے کر کشمکش میں ڈالا جائے۔ یہ کشاکش اور کشمکش روز ازل سے شروع ہوئی تو ابد تک جاری رہے گی۔ شیطان کے پاس بے شمار ''ہتھیار'' تھے آدم و اولادِ آدم کو بہکانے اور زیر کرنے کے تو آدم وحوا اور اولادِ آدم وحوا کو ایک ایسا ''ہتھیار'' مقابلے کے لیے دیا گیا، جو ''خودکار'' ہے جونہی شیطان اپنے ''اسلحے'' کے ساتھ حملہ کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کو عطا کردہ خودکار ''ہتھیار'' اسے حملہ سے آگاہ کر دیتا ہے۔ ہوشیار، عقل مند، انسان فوراً اپنا دفاع کر لیتا ہے۔ اور شیطان کو حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی اور اگر کبھی انسان غفلت برتے اور اس غفلت میں بڑھتا ہی جائے اور اس خودکار نظام دفاع کی پروا نہ کرے تو پھر وہ انسان شیطان کے قابو میں آ جاتا ہے۔ یہ نفس امارہ اور نفس لوّامہ کے درمیان ایک ازلی کشمکش ہے اور جب نفس امارہ کا غلبہ ایک انسان سے شروع ہو کر خاندانوں، قبیلوں اور قوموں تک جا پہنچتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ کا مظہر انبیاء ہوتے ہیں۔ جو نفس امارہ کی حیلہ سازیوں اور اس کے بنیادی کردار شیطان سے بچاؤ کے طریقے بتاتے ہیں اور اس خودکار نظام دفاع (نفس لوّامہ) کی اصلاح اور تربیت کرنے آتے ہیں۔ انسان کی تخلیق ہی ایسی ہے کہ وہ انفرادی طور پر ایک استاد، ایک ناصح، خیر خواہ رکھتا ہے جو اس کو بغیر لالچ کے اور مطالبہ سے پہلے ہی متنبہ کرتا ہے کہ اچھا کیا ہے؟ برا کیا ہے؟۔ جس کو ضمیر یا نفس لوّامہ کہتے ہیں۔ اسی کی بدولت دنیا کا برا سے برا انسان بھی جھوٹ، دھوکہ دہی، قتل و غارت وغیرہ جرائم کو برا ہی جانتا ہے۔ گویا ایک آئینہ انسان کی شخصیت کے ساتھ ہی فٹ کر دیا گیا ہے، جس میں وہ اپنی شکل دیکھتا رہے۔

انبیاء بھی انسانوں کو آئینہ دکھانے کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔ انبیاء کے پیروکار بھی اسی راستے پر چلے۔ ہر دور میں ہر نبی اور ہر متنبہ کرنے والے کے ساتھ لوگوں نے ایک جیسا سلوک کیا۔ کسی نے اپنا ضمیر اپنا آئینہ توڑ ڈالا کہ اپنی شکل شناخت کرنے کے قابل نہ تھی۔ انبیاء کو قتل کر دیا جھٹلا دیا......

اپنے نفس لوامہ اور ضمیر کو سلا دیا۔ مار دیا۔ قد خاب من دسّٰھا......

اور جس نے آئینہ دکھانے والے انبیاء کی بات مانی اور تسلیم کیا۔ اپنے اعمال درست کیئے تو وہ فلاح پا گئے بے شک جس نے اپنا تزکیہ کیا۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر اپنی حالت درست کر لی انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ قد افلح من زکّٰھا۔

انبیاء کے تزکیہ کا کام خود رب العالمین کرتے ہیں اور اپنے بندوں کے تزکیہ کے لیے کچھ ''خاص بندے'' (انبیاء) منتخب کئے گئے۔ ضمیر کی آواز پر دھیان دینا اپنا احتساب کرنا۔ ہر انسان اور گروہ اور قوم کے لیے لازمی امر ہے۔ زندگی، عمر یا زمانے کا کوئی وقت یا معاملہ ایسا نہیں ہے جو احتساب سے مبرا ہو یا ضمیر سے پہلوتہی ممکن ہو۔ یا آئینہ میں اپنی صورت دیکھنے سے انکاری ہو۔ وہ ایک فرد ہو یا قوم جب تک خود کو ضمیر کے سامنے پیش کر کے اپنا کڑا احتساب کرتی رہے گی اور آئینے میں جھانکتی رہے گی فلاح کی طرف گامزن رہے گی۔ دنیا کا کوئی گروہ، قوم یا خاندان یا انسان کسی مرحلے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی تربیت کا مرحلہ مکمل ہو گیا اور تزکیہ کی ساری گھاٹیاں عبور ہو گئی ہیں۔ جو بھی خود کو احتساب سے مبرا جانتا ہے وہ تعصب کا شکار ہے۔ تکبر کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ کوئی انسان گروہ، قوم یا خاندان دوسروں کا احتساب اپنا فرض جانے مگر اپنے احتساب یا اصلاح کا حق کسی کو نہ دے۔ بلکہ کبھی شبہ بھی ہو جائے کہ کوئی یہ حق استعمال کرنا چاہتا ہے تو برا مان جائے۔

انبیاء کے بعد ان کے ''وارث'' متعصب، متکبر لوگوں کے ظلم کا

نشانہ بنتے رہے اور یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔اور یہ بھی اٹل حقیقت رہے گی کہ جو جتنی بڑی ذمہ داری کے منصب پر بٹھایا گیا اس کا اتنا ہی کڑا احتساب ہوگا۔ان کا تزکیہ اتنی ہی زیادہ مشکل گھاٹی میں اتار کر کیا جائے گا۔ذمہ داری کا منصب خود یہ فیصلہ کرتا ہے کہ منصب دار کو کندن بنانے کے لیے سختیوں، آزمائشوں اور احتساب کی کتنی سخت آنچ والی بھٹی پر تپایا جائے۔اسی لیے انبیاء کی آزمائشیں زیادہ ہوتی رہی ہیں۔پھر انبیاء کے مشن کو لے کر اٹھنے والے اپنے اخلاص کے پیمانے کے مطابق آزمائے جاتے رہے۔احتساب کی کڑی کمان وہ خود منتخب کرتے رہے۔ساتھیوں کو مجبور کر کے اپنے نفس امارہ کے کانٹے چنواتے رہے۔انسان، گروہ، جماعتیں جب اپنے نفس امارہ کو نہ مار سکیں تو پھر آخر وہ کیا تیر ماریں گی؟

انسان کچھ اور نہ بھی ذمہ داری اٹھائے انسان ہونا ہی ایک ذمہ داری ہے۔ہر سانس اس کی ذمہ داری ہے۔اس لئے کہ ہر سانس کی اپنی ذات کی جواب دہی کرنا ہوگی پھر رشتے، ناطے کی ذمہ داریاں ہیں۔مسلمان ہونا عظیم ذمہ داری ہے اور مسلمان ہونے کی مسند پیش کرنے کے لیے شہادت حق کی ادائیگی ضروری ہے۔اگر ذمہ داری ہی انسان کے لیے زندگی بھر کا منصب ہے تو مسلمان کے لیے شہادت حق کی ذمہ داری ادا کرنا ہی اخروی نجات کا باعث ہے۔یہی مسلمان کا مقصد حیات ہے۔اور جب زندگی کا مقصد عظیم الشان ہو تو کوئی فرد ہو یا گروہ اسے حوصلے، استقامت، ظرف اور تزکیہ نفس کی ضرورت بھی اسی شان کی اور اعلیٰ پیمانے کی مطلوب ہوتی ہے اور اپنے ''خودکار نظام دفاع'' کی حفاظت کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہوتا ہے۔دشمن کے حملے کا مقابلہ سراسر ''نظام دفاع'' کی بہتر کارکردگی پر منحصر ہے۔

☆......☆......☆